JUNE
2022

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

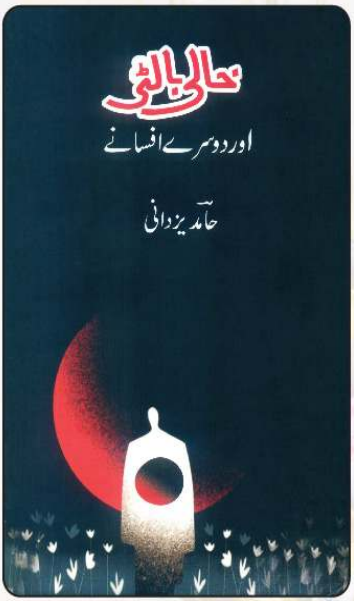
خالی بالٹی
اور دوسرے افسانے
حامد یزدانی

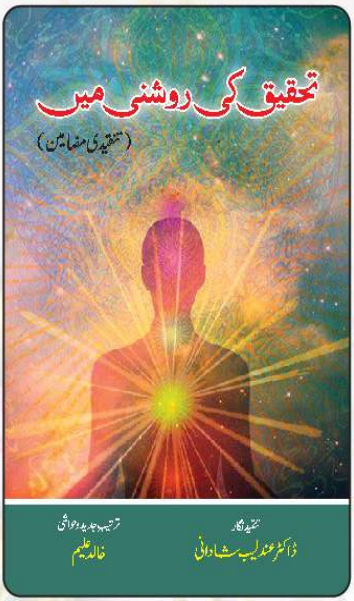
تحقیق کی روشنی میں
(تحقیقی مضامین)
تنقید نگار
ڈاکٹر عندلیب شادانی
ترتیب جدید و حواشی
خالدہ علیم

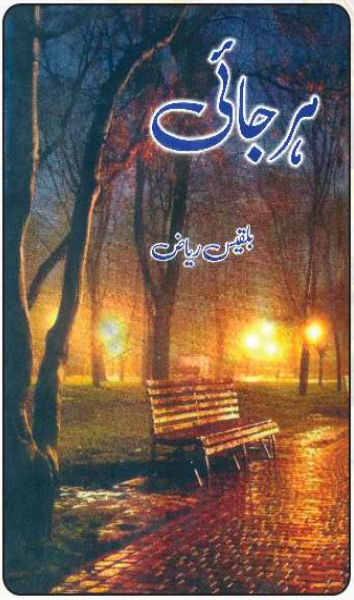
ہرجائی
بلقیس ریاض

شعری مجموعہ
نشاطِ رفتہ
عندلیب شادانی

بجے آھن گر کے

آگ کے تپ سے اور تپ اُٹھے
خون سے تپتے گال
پھولوں جیسے ہاتھوں میں ہے
لوہا لال گلال

یقین

چھتیں ٹپکتی رہیں،
اپنا یہ عقیدہ ہے
ہر ایک بُوند کے ہمراہ
اِک فرشتہ ہے

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدید تر ادب کا شاریہ

ماہنامہ بیاض لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 30 - جون 2022 - شمارہ نمبر: 6

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران

کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق:

قیمت: 100 روپے

سالانہ زر اعانت 1000 روپے بیرون ملک 100$ پاکستانی روپے میں

فیصل بینک لمیٹڈ

ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور

اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلومیٹر ملتان روڈ لاہور-53700

فون: 92-42-37513000-3 فیکس: 92-42-37512517

Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک اینڈ ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر رائل پارک سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	سرور حسین نقشبندی	7
2	نعت	جلیل عالی، حسن عسکری کاظمی، سید ریاض حسین زیدی، نسیم سحر صفدر صدیق رضی، علی رضا، سرور حسین نقشبندی، اعجاز دانش	8 تا 15
3	عقیدت	محمد یٰسین قمر، مرزا آصف رسول، اویس جمیل الغانی	16 تا 18
4	تصوف	سلیمان عبداللہ ڈار	19 تا 22
5	مباحثہ	[نقاد کی موت حلقہ، ارباب ذوق پاک ٹی ہاؤس صدر: شفیق احمد خان، ڈاکٹر ایوب ندیم، ڈاکٹر غافر شہزاد فرحت عباس شاہ، علی نواز شاہ، تاثیر نقوی، نذیر ساگر فیصل زمان چشتی، اعجاز رضوی]	23 تا 34
6	مضامین	ابدال بیلا، شاہدہ دلاور شاہ، رانا خالد محمود قیصر، شاہد مالکی صغیر احمد صغیر، سیدہ آمنہ ریاض، عبدالرؤف کیانی، رانا محمد شاہد، اعجاز رضوی	35 تا 76
7	آپ بیتی	شوکت علی شاہ	77 تا 85
8	ترجمہ	عامر رضوی (کہانی موپساں)	86 تا 100
9	طنز و مزاح / خاکے	رخشندہ نوید، محمد کلیم	101 تا 115

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
10	غزلیں	خالد احمد، سحر انصاری، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی جمیل یوسف، غلام حسین ساجد، حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر اعجاز کنور راجہ، خاور اعجاز، گلزار بخاری، خالد علیم، ضیاالدین نعیم اسلام عظمی، صفدر صدیق رضی، محمد انیس انصاری، آغا نثار، راحت سرحدی اقبال سرویہ، یوسف خالد، اکرم ناصر، احمد جلیل، منظور ثاقب تاثیر نقوی، شوکت محمود شوکت، ذکی طارق، ملیحہ سید، شکیل جاذب حسنین سحر، شہزاد نیر، اعجاز روشن، رخشندہ وحید، عقیل رحمانی، مسعود احمد افتخار شاہد، مظفر حسن بلوچ، علی حسین عابدی، طلعت شبیر، محمد نوید مرزا محمد سلیم ساگر، تسنیم کوثر، فخر عباس، فیصل ہاشمی، ریاض ندیم نیازی شبہ طراز، اشرف کمال، اظہر فراغ، مرزا سکندر بیگ، محمود کیفی تاثیر جعفری، صغیر احمد صغیر، انصر حسن، اکرم جاذب، بشیر احمد حبیب شاہد ماکلی، منصور فائز، سید فرخ رضا ترمذی، زبیر فاروق اعجاز دانش، سرور فرحان، علمدار حسین، فیصل زمان چشتی شبیر ناز ش، سید ضیا حسین، انور شیرازی، وسیم جبران، عمر قیاز قائل احمد مسعود، مظہر حسین مظہر، عنبرین خان، شفقت حیات شفق نائلہ راٹھور، خالق آرزو، علی رضا بلوچ، محمد مسعود اختر، امجد بابر کیفی قلندر، امتیاز انجم، امر مہکی، شہاب اللہ شہاب، رانا محمد شاہد رضی رضوی، شعیب عدن، محمد علی ایاز، زین علی رضوی، اعجاز رضوی	116 تا 201
11	افسانے	عاصم بخاری، حبیب الرحمٰن، گل بخشالوی، نجم رضوی، وسیم جبران	202 تا 224
12	شاعرِ امروز	علی ادراک، شاہد نواز [شاہد ماکلی]	225 تا 230
13	نظمیں	امجد اسلام امجد، خاور اعجاز، تابش کمال، طالب انصاری کیفی قلندر، کوکی گل، نائلہ راٹھور، غلام مرتضیٰ	231 تا 238
14	خطوط	شہزاد نیر، طالب انصاری، اشرف کمال، رانا محمد شاہد	239 تا 241

حمد

جان و دل کی بہار الااللہ
روح کو دے قرار الااللہ

اس میں اثبات حق تعالیٰ ہے
ذکر کا لالہ زار الااللہ

ایک جلوہ دکھائی دے گا بس
جب ہوا آشکار الااللہ

سن توجہ سے ورد کرتا ہے
سانس کا تار تار الااللہ

خوف و وحشت سے ماورا ہو جا
صرف کہہ ایک بار الااللہ

چشمۂ خیر لا الہ کا ورد
برکتوں کا حصار الااللہ

عاجزی کا عروج ہے اس میں
بندگی کا وقار الااللہ

وقتِ گریہ یہی وظیفہ کر
دیدۂ اشکبار الااللہ

ایسے دل میں اتر زمانے کے
دل میں سرور اتار الااللہ

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

جادۂ عشق میں تابندہ علم تیرے ہیں
کیا بتائیں ہمیں کیا نقشِ قدم تیرےؐ ہیں

دوسرا کون ہے اس شان کا ممدوح کوئی
وصف جیسے سرِ قرطاس و قلم تیرےؐ ہیں

اک تریؐ دُھن ہے ہمارے لیے آہنگِ حیات
شوق سینے میں بہم آنکھ میں نم تیرےؐ ہیں

دل کسی موسم و ماحول کا محتاج نہیں
ہوں کسی حال میں بھی ہم ہمہ دم تیرےؐ ہیں

کیا مجال آنکھ اٹھے اپنی کسی اور طرف
آخری سانس تلک تیری قسم تیرےؐ ہیں

یاد رکھتی ہے تریؐ کیفِ دگر میں ان کو
شہرِ توفیق میں جو صاحبِ غم تیرےؐ ہیں

مالکِ کُل نے کیا مولا و مختار تجھے
یہ جہاں تیرا ہے فردوس و ارم تیرےؐ ہیں

تیرے عشاق سے ملتے ہیں تو رشک آتا ہے
صاف دِکھتا ہے کہ ہم تو کہیں کم تیرےؐ ہیں

اپنے اعمال تو ایسے نہیں پھر بھی آقاؐ
تیری نسبت ہے میسر تو کرم تیرےؐ ہیں

جلیل عالی

نعتؐ

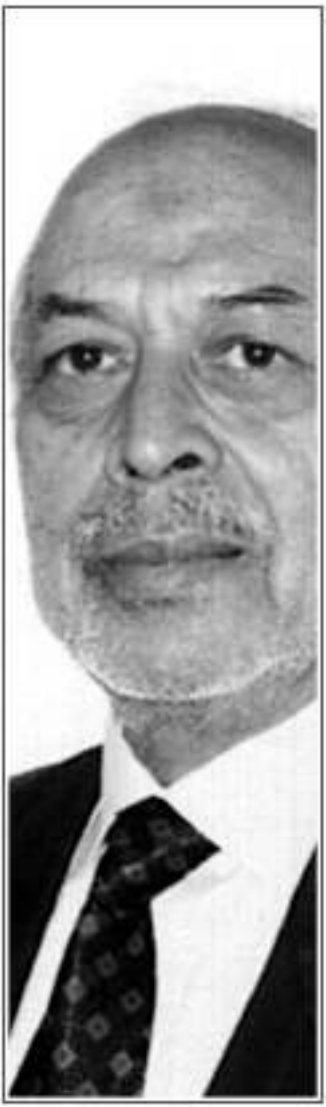

مدحت سرا پہ معنیِ حرفِ ثنا کھلے
اسمِ جمال سیّدِ خیرالوریٰ کھلے

آقاؐ کے ہر عمل میں ہے خیرِ عمل نہاں
اُنؐ کی ہر ایک بات سے رازِ بقا کھلے

بحرِ وفا میں شورِ تلاطم ہوا بپا
پھر بادبانِ کشتیِ دستِ دعا کھلے

عرفان و آگہی کی طلب ہے اگر تجھے
ساقی سے عرض کرکے درِ میکدہ کھلے

ایسا نہ ہو کہ رحمتِ حق ہم سے دور ہو
جو کھل سکا نہ بھید وہ روزِ جزا کھلے

اُمّت میں انتشار کی صورت وہی رہی
دینِ مبیں کا کیسے مگر مدعا کھلے

پیشِ حضورؐ آگیا گریہ کناں حسنؔ!
ممکن ہے یوں بھی حالِ دلِ بے نوا کھلے

حسن عسکری کاظمی

نعتؐ

سخن کی شاخ میں ادراک کی خوشبو بسانے سے
مرا دل گل فشاں ہے آج نعتیں گنگنانے سے

شہِ کونینؐ کی نسبت سے جو بھی دل دھڑکتا ہے
وہی دل معتبر ہے سب جہانوں کے خزانے سے

جہانِ آخرت میں سرخروئی نعت سے ہو گی
دمِ آخر یہی لے جائیں تحفہ اِس زمانے سے

تقاضا ہے محبت کا ، یہی ہو کام ہر لمحہ
کہ ہر غیرِ خدا سے چھُوٹ جائیں دل لگانے سے

اگر یہ دل کی دھڑکن آپؐ ہی کا ذکر بن جائے
تو ساری عمر کٹ جائے گی آقاؐ اس بہانے سے

دعا مقبول ہوتی ہے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ندامت نے مجھے زندہ کیا آنسو بہانے سے

مبارک ہو جو نعتِ مصطفےٰؐ دل میں اُتر آئے
رگ و ریشہ میں جاں آتی ہے اس کے جگمگانے سے

ریاضِ مدحتِ خیرالورا سے نکہتیں مُہوئیں
معطر دل ہوا ہر دم نبیؐ کے آستانے سے

سید ریاض حسین زیدی

نعتؐ

ہو گئی اُن کی عطا، نعت ہوئی
جب کہا صلِ علیٰ، نعت ہوئی

با وضو رہنے کی عادت ڈالی
اور پھر صبح و مسا نعت ہوئی

کتنے موضوع نئے سُوجھے ہیں!
ایک سے ایک جُدا نعت ہوئی

یاد بُوصیری و حسّان آئے
یاد جب اُن کو کیا، نعت ہوئی

یہ بھی اَسرار خُداوندی ہیں
حمد جب کہنے لگا، نعت ہوئی

آ گیا چین مُجھے پل بھر میں
دل جو بے چین ہوا، نعت ہوئی

کتنا نزدیک تھا افلاک سے مَیں !
جب سرِ غارِ حِرا نعت ہوئی

پھیلتی جاتی ہے خوشبو ہر دم
جب کوئی پھُول کِھلا، نعت ہوئی

میں جو اِس کام پہ مامور ہوا
جب غزل کہنے لگا، نعت ہوئی

نسیمِ سحر

نعتؐ

دل میں اک عمر سے برپا ہے جو ہنگامۂ نعت
لب پہ ہے صلِ علیٰ ہاتھ میں ہے خامۂ نعت

میں تو کرتا ہوں فقط سیرتِ سرکار کا ذکر
اور الفاظ پہن لیتے ہیں خود جامۂ نعت

اسقدر مختصر و سہل نہ جانو اس کو
بے کراں بحر ہے گویا، نہیں پانامۂ نعت

مُترادف تو بہت کچھ ہے لکھوں یا نہ لکھوں
اک طرف خامۂ حمد ایک طرف خامۂ نعت

نامہ بر میرے درودوں کے ملائک ہیں رضیؔ
ڈاکخانوں سے نہ بھجواؤں گا میں نامۂ نعت

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

چہرہ تمام رنگ تھا ، پیکر کرن تمام
کجلا کے رہ گئے مہ و پروین تن تمام

نعتؐ

درود پڑھتے ہوئے نعت گنگناتے ہوئے
میں پُل صراط سے گزروں گا مسکراتے ہوئے

کسی طرح بھی نگاہوں کو بھولتے ہی نہیں
وہ رنگ و نور میں دیوار و در نہاتے ہوئے

بروزِ حشر اُٹھوں گا بڑا یقیں ہے مجھے
میں اپنے حرفِ عقیدت کی داد پاتے ہوئے

گناہ گار تھا غم سے نڈھال ہو رہا تھا
خود اپنی ذات کو میں آئینہ دکھاتے ہوئے

میں جیسے پاسِ ادب سے حواس کھو بیٹھا
نبیؐ کے شہر کی جانب قدم اُٹھاتے ہوئے

بچھائے دامنِ دل گڑگڑاتے دیکھے ہیں
بڑے بڑے وہاں رودادِ غم سُناتے ہوئے

نبی کی سیرت و کردار کے اُجالے میں
ہمیشہ ملتا ہوں دشمن سے مُسکراتے ہوئے

ندامتوں سے شرابور ہوں تبھی تو رضاؔ
میں ڈر رہا ہوں درِ مصطفیٰؐ پہ جاتے ہوئے

علی رضا

نعتؐ

یوں بھی مدینہ چھوڑ کے جانا تو ہے نہیں
ہم بے کسوں کا اور ٹھکانہ تو ہے نہیں

رحمت ہیں حشر تک وہ ہر اک دور کے لئے
ختم رسل کا ایک زمانہ تو ہے نہیں

کرتے ہو کیوں گلہ کہ زمانے میں خوار ہیں
دل سے نبیؐ کی بات کو مانا تو ہے نہیں

ہم عاصیوں کا ان کی شفاعت پہ ہے مدار
حسنِ عمل کا پاس خزانہ تو ہے نہیں

رکھتے ہو بغض آل سے لیکن بروز حشر
تم کو کسی نے اور بچانا تو ہے نہیں

ہم سائبانِ نعت میں رہتے ہیں اس لئے
بخشش کا کوئی اور بہانہ تو ہے نہیں

حسِ جمال کیوں نہ مدینے میں ہو فزوں
موسم کہیں کا ایسا سہانا تو ہے نہیں

ان کی گلی میں بیٹھنے والے فقیروں نے
دنیا کی سمت ہاتھ بڑھانا تو ہے نہیں

انداز و طرز، مدح کے شایانِ شان ہو
نعتِ حضور ہے کوئی گانا تو ہے نہیں

ان کے سوا کوئی نہیں اپنا سو حالِ دل
سرور کسی کو اور سنانا تو ہے نہیں

سرور حسین نقشبندی

نعتؐ

دیکھ کر شان رسالت قلب و جاں
ہو گئے ہیں محو حیرت قلب و جاں

ہو مبارک شہر طیبہ کا سفر
ہو مبارک یہ سیاحت قلب و جاں

ہیں ملائک دم بخود جن کے حضور
کیسے پھر کرتے جسارت قلب و جاں

الفتِ آقاؐ سے پاتے ہیں سکوں
جانتے ہیں یہ حقیقت قلب و جاں

ہے خدا کے بعد درجہ آپؐ کا
دے رہے ہیں یہ شہادت قلب و جاں

یہ درودِ مصطفیٰؐ کا ہے کمال
اس سے پا جاتے ہیں فرحت قلب و جاں

ہوں غلامان محمدؐ کا غلام
میری کرتے ہیں وکالت قلب و جاں

کاش دانش کو بھی مل جاتا سکوں
کاش کر لیتے زیارت قلب و جاں

اعجاز دانش

عقیدت

یہ میرا ارمغانِ ثنا کلیاتِ نعت
یارب بنے بفیضِ نبی عطریاتِ نعت

ہو جائیں طے اک آن میں صدیوں کے فاصلے
ہوتی ہے جب بھی دل پہ مرے وارداتِ نعت

قرآن پڑھ رہا ہوں عقیدت سے صبح و شام
تشکیل پا رہی ہے مری لفظیاتِ نعت

قربِ نبی، رضائے الٰہی، فلاح و فوز
کیسے بتائے کوئی بھلا حاصلاتِ نعت

بس پھیلتے ہی جاتے ہیں آفاق فکر کے
جس آن سوچتا ہوں حدود و جہاتِ نعت

رکھ سامنے تو جامی و تائب کا سوز و عشق
گر سیکھنے کا شوق ہو اے دل! نکاتِ نعت

رہتے ہیں اس کے لفظ تر و تازہ اے قمر
کرتا ہے آنسوؤں سے رقم جو لغاتِ نعت

محمد یٰسین قمر

احسن البشر

مدحِ مصطفیٰ اور یہ نظمیات لفظوں کی
بات بن گئی میرے بے نکات لفظوں کی

ایک سطر بھی پوری ہو نہ ان کی مدحت کی
وقف چاہے کر دیجے کائنات لفظوں کی

ذکر و شکر کا رتبہ آپ کے مکارم ہیں
آپ نے بڑھائی ہیں حیثیات لفظوں کی

روضۂ ادب میں جو پھول چن رہا ہوں میں
یا ہیں لفظ نعتوں کے یا ہے نعت لفظوں کی

جس قدر بلیغ ان کے لفظ، اس سے بھی بڑھ کے
وا کریں خُلق ان کے رمزیات لفظوں کی

عشقِ مصطفیٰ میں یہ دل نہیں عوض اس کا
اے خرد جو دولت ہے تیرے ہات لفظوں کی

اے فقیرِ طیبہ یہ کیسا کاسۂ غم ہے؟
در بہ در پھرے اور پھر لے زکوٰۃ لفظوں کی

ذکر جب سراپائے احسن البشر کا ہو
خود بھی حسن بن جائیں حسیات لفظوں کی

عصمت و تقدس کو آپ نے کیا زندہ
آپ کے معانی سے ہے حیات لفظوں کی

عُقدے آپ نے کھولے آ کے ہر عقیدے کے
ورنہ کب تھیں بامعنیٰ مرویات لفظوں کی

شانِ حق کا وہ مظہر سب کے سب فدا ان پر
وصفِ حسن و زیبائی اور صفات لفظوں کی

کھولا علمِ نافع کا ان کے اُسوہ نے معنیٰ
علمِ بے عمل یعنی درسیات لفظوں کی

رفعتِ محمد میں گم ہیں آسماں بھی سب
اور ادھر زمیں پر ہی ممکنات لفظوں کی

ان کے اسوہ سے روشن سب مکارمِ اخلاق
ورنہ تھی معانی پر کب سے رات لفظوں کی

ہیں رواں جو اشکوں سے آ کے ان کے روضے پر
وہ عقیدتیں کب تھیں؟ تابعات لفظوں کی

لفظ ہیں محمد کے لا الٰہ الا اللہ
روشنی بھی اُن سے ہے اِن ثقات لفظوں کی

ان سے عشق کا آصفؔ! حق ادا کریں کیسے؟
ہم تو صرف پاتے ہیں کیفیات لفظوں کی

مرزا آصف رسول

خاتم الانبیا

تو کجا من کجا خاتم الانبیا
ہر جہاں ہے فدا خاتم الانبیا

آپ ہی آپ ہیں فرش سے عرش تک
ہر افق ہے صدا خاتم الانبیا

ہر کسی کو خدا کی رضا چاہیے
تو خدا کی رضا خاتم الانبیا

ہے یقیں روز محشر بنے گا شہا
تو مرا آسرا خاتم الانبیا

نفرتوں کے مٹائے ہیں بت آپ نے
اور پھر حق دیا خاتم الانیا

ہے محمد ہی میرا رسول آخری
یہ خدا نے کہا خاتم الانبیا

ہے محمد فقط زندگی کا مری
رہبر و رہنما خاتم الانبیا

ہے جو غانی! عطا مصطفیٰ کی مرے
ہے اسی میں بقا خاتم الانبیا

اویس جمیل الغانی

محبت کی دریافت

کوئی اگر چاہے تو کسی کے دل میں زبردستی اپنی محبت پیدا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح کوئی اگر چاہے تو کسی کے دل سے زبردستی اپنی محبت یا کسی کی محبت نکال بھی نہیں سکتا یہی فارمولا رب کی محبت کا بھی ہے کہ یہ محنت کر کے دلوں میں پیدا نہیں کی جا سکتی نہ ہی دل سے نکالی جا سکتی ہے یہ تھوڑی یا زیادہ نہیں ہوتی محبت بس محبت ہے یہ ہو جاتی ہے اور اس ہونے کو پوری دنیا بھی زور لگا دے تو ہونے سے روک نہیں سکتی اس کا ہونا ہی عین ہوتا ہے بلکہ رب کی محبت یا سرکارؐ دو عالم کی محبت دونوں ایک ہی ہیں دونوں ہی فاتح عالم ہیں دونوں ہی کسی بھی پیمانے سے نہ ناپی جا سکتی ہیں نہ تولی جا سکتی ہیں کہ کسی لامتناہی کو حدوں یا دیواروں میں قید تو نہیں کیا جا سکتا اک چھوٹی سی سرائیکی نظم ہے۔

اُچیاں لمیاں کندھاں
ڈک نہ سکن
پھلاں نی خشبو

محبت کی خوشبو اور خوشبو کی محبت دونوں ہی خوبصورت ہیں محبت کو اپنے معاملات کا حصہ بھی بنانا ہوگا رات بھر گہری نیند کا آنا اتنا آسان نہیں اس کے لئے پورا دن لوگوں میں محبت کو بانٹنا ہوگا کہ اسے تقسیم کرنا کبھی تو اولی اور کبھی اولی تر ہوتا ہے۔ محبت روح کی بھی ہوتی ہے جسم کی بھی جسم کی ہو تو یہ محبت کی اک پیروڈی یا بھونڈی شکل ہے روح کی ہو تو یہ ہوس سے بالاتر اک پاکیزہ معراج بھی ہے محبت کوئی بھی ہو کیسی بھی ہو کسی سے بھی ہو اس میں بعض اوقات اک ایسا مرحلہ آتا ہے کہ اس مقام پر پھر ہوس اور محبت میں کوئی فرق نہیں رہتا۔

وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ جوانی میں ہر بات محبت سے بھرپور لگتی ہے نفرت کو بھی فرد گزاشت کو بھی لڑکپن میں ہنس کر ٹال دیا جاتا ہے۔ جوانی بڑھاپے سے گلے مل کر جدا ہو جاتی ہے بندے کو خبر ہی نہیں ہوتی پھر کان کمزور ہو جاتے ہیں کہ محبت بھرے نغمے یا مکالمے اور سندیسے سن ہی نہیں سکتے پھر نظر کمزور ہونے لگتی ہے کہ محبت بھرے چہرے اور مناظر واضح طور پر نظر ہی نہیں آسکتے کچھ عرصہ اور گزارتا ہے تو بندہ صاحب فراش ہو جاتا ہے اب کسی محبت بھری محفل میں جانہیں

سلیمان عبداللہ ڈار

سکتا کسی محبت بھری شخصیت سے ملنے کے لیے سفر نہیں کر سکتا اور اسے اپنے پاس بلا بھی نہیں سکتا یا اظہار کرنے ہی سے قاصر ہو جاتا ہے اب محبت کے لیے وقت بھی نہیں اور نفرت کی بھی طاقت نہیں تو بس مضمحل ہونے لگتے ہیں عناصر میں اعتدال ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔ نگاہوں کو خیرہ کرنے والے جو چند دن تھے جب کسی کا انتظار ہوتا تھا جب کچھ کہنے والے کہتے تھے۔

،،اجی ہم تو آپ کے لیے مرے جا رہے ہیں،،

وہ دن ہوا ہوئے وہ دن راہی ملک عدم ہوئے بچوں کے پاس اتنا وقت ہی نہیں ہوگا کہ میرے پاس کچھ دیر بیٹھ سکیں محبت کرنے والے اک اک کر کے رخصت ہو جائیں گے اور محبت بھی رخصت ہو جائے گی۔ اس سے پہلے کہ محبت کرنے والے اس بڑھاپے میں الگ ہوں خود ہی کیوں نہ الگ ہو جائیں کہ پھر محبت بھرے رشتوں کی علیحدگی سے دل شکنی تو نہ ہوگی۔

رب کریم نے بندے کے لیے اور محبت کرنے والی روح کے لیے،،ارجعی،، کا لفظ ارشاد فرمایا یعنی یہ نہیں کہا کہ میری طرف آؤ یہ کہا لوٹ آؤ راقم سالہا سال قبل جب نشتر میڈیکل کالج میں زیر تعلیم تھا تو ان الفاظ کے ذائقے سے آشنا ہوا گھر کو لوٹ کر جانے میں ایک شوق وارفتگی انتظار اور محبت کے ساتھ ساتھ اک تمنا پوشیدہ ہوا کرتی تھی ان دنوں موبائل اور نیٹ تو ابھی ایجاد نہیں ہوئے تھے یا اتنے عام نہیں ہوئے تھے گھر سے پانچ سو کلومیٹر دور تھے کبھی دو ماہ بعد ابا جی کا خط آتا تو بہت خوشی ہوا کرتی تھی۔ تعطیلات ہوتیں تو سب ہم جولی خوشی سے اچھلتے کودتے ریل کار سے گاؤں کی طرف روانہ ہوتے تو کہا کرتے۔

RAIN BOW SAYS

HAPPY VACATIONS

ارجعی میں بھی وہی محبت والی وارفتگی ہے کہ بندہ شوق کے ہاتھوں مجبور ہو جائے پھر اپنے دل میں اپنے رب کی محبت دریافت کر لے تو اپنے رب کی طرف لوٹ آئے کیسی بے ساختگی ہے اور کیسی برجستہ دریافت ہے یہ بھی! کہ اب بندہ گناہوں کو الوداع کہہ رہا ہے اب جو میرا مالک کہے گا ویسا ہی کروں گا۔ اب لوٹ آیا ہوں صرف واپس ہی نہیں آیا اک جذبہ لے کر آیا ہوں اک تعلق دریافت کر کے آیا ہوں۔ اک ایسی الفت ایجاد کر کے آیا ہوں جو دل دولگاہ کو اپنی طرف کھینچتی ہے یونہی تو لوٹ کر نہیں آیا بلایا گیا ہوں خود نہیں آیا لایا گیا ہوں جو لایا جائے وہ محبت سے منکر ہو ہی نہیں سکتا اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ یہ محبت اسکے جسم سے اعمال نکلواتی ہے جب محبت اور گہری ہو تو پھر اعمال میں اثر پیدا کرتی ہے اسی لئے میں اکثر سوچتا ہوں کہ دنیا کے ہر شخص پر میرا اثر ہے اور ہر ہر شخص کا مجھ پر کوئی نہ کوئی ضرور اثر ہے چاہے میں اسے دیکھ سکوں یا نہ دیکھ سکوں محسوس کروں یا نہ کروں میں اسے مانوں یا نہ مانوں تسلیم نہ کرنے سے محبت نہ تھوڑی ہو جاتی ہے نہ کم ہو جاتی ہے بلکہ ایسے حالات میں تو یہ

اپنا آپ منوا کر رہتی ہے یہ سفر آغاز بھی کروائے گی اور اختتام تک آپ کے ساتھ ساتھ جائے گی جیسے رسالت مآب سے ایک صحابیؓ نے پوچھا کہ یہاں تو جب چاہیں محبت سے آپؐ کا دیدار کر لیتے ہیں حشر کے بعد اس نہ ختم ہونے والی زندگی میں آپ کو جنت ہی میں سہی مگر کہاں تلاش کریں آپؐ تو جنت کے بہت اونچے درجوں پر فائز ہو گئے ہم وہاں جا بھی سکیں گے یا نہیں۔ تو فرمایا۔

،، جنت میں غریبوں کا ڈیرہ پوچھ لینا محمدؐ وہیں ملیں گے اور جہاں جہاں میں جاؤں گا یا رہوں گا یہ غربا میرے ساتھ ساتھ رہیں گے۔ یہی میرا پتہ ہے میرا اڈریس ہے میرا سائنواں ہے،

میں سوچتا ہوں ساتھ ساتھ غربا نہیں محبت رہے گی ساتھ ساتھ پاس پاس آس پاس محبت رہے گی محبت ہی چلے گی اس کا غذی دنیا میں بھی اگر یہ جذبہ ساتھ ساتھ رہے تو انسانوں کو ملکوں کو بلکہ براعظموں کو تسخیر کر سکتا ہے اور اس نے کیا بھی تھا۔ محبت بندے سے بڑے بڑے عظیم کام کروا سکتی ہے کیا اس دور میں یا آج کل کوئی ہے جو اپنے بیوی بچوں کو آدھی رات کے وقت چھوڑ کر دنیا کے دکھوں کا علاج ڈھونڈنے نکلے پھر نروان کو تلاش کرے یا روشنی کو کھوجنے کا جذبہ اپنے دل میں محسوس کرے اگر کوئی ایسا سوچتا ہے یا کرتا ہے تو وہ اس دور کا وہ آج کا گوتم بدھ ہے مہاتما ہے اور یہ کرشمہ صرف اور صرف محبت ہی کی ایجاد ہے یہ ہمیں سکھاتی ہے کہ اگر بادشاہ شہزادے یا حکمران اہم ہیں تو عام آدمی کسان اور محنت کش بھی اہم ہیں ہو سکتا ہے ان میں کوئی ایسی بات ہو جو حکمرانوں میں اور بادشاہوں میں نہ ہو یا ہیروز میں بھی مفقود ہو۔

دل محبت کی آماجگاہ ہے دل ہی نفرت کا مرکز بھی ہے وہی زمین جو فصلیں پیدا کرتی ہے معدنیات پیدا کرتی ہے دریاؤں اور سمندروں کو اپنی چھاتی پر جگہ دیتی ہے کسان کو اپنا سینہ چھیلنے کی اجازت دیتی ہے مگر یہی زمین زلزلہ بھی تو پیدا کرتی ہے محبت اک روشنی ہے ازلی اور ابدی بھی روپہلی اور استقامت سے بھرپور بھی نازک اندام بھی اور مضبوط بھی یعنی SOFT BUT STRONG سب کچھ قربان کر دینے والی بھی سب کو اپنا نیا لینے والی بھی دوریاں مٹانے والی بھی اور قرب عطا کرنے والی بھی بے چینی ختم کرنے والی بھی سکون دلانے والی بھی سفر نصیب کرنے والی بھی منزل عطا کرنے والی بھی راستے سے روڑے ہٹانے والی بھی جان جان کہنے والوں سے جان کی قربانی دلوانے والی بھی جب یہ اک روشنی ہے نور ہے تو پھر نہ ہی یہ مر سکتی ہے نہ ہی کم ہو سکتی ہے یہ ایسی روشنی ہے کہ اس کی عدم موجودگی ہی کا نام اندھیرا ہے اندھیرا مستقل نہیں ہوتا روشنی ہی مستقل ہوتی ہے اور اسے ہی دوام حاصل ہے۔ اندھیرا بالکل عارضی اور لمحاتی ہوتا ہے کہیں سے کبھی بھی اک کرن آ پہنچی تو اندھیرے کی

مودت واقع ہو جائے گی محبت بھی کیا شئے ہے بھلے چنگے کو دیوانہ بناتی ہے کیسا دلفریب جذبہ ہے کہ دل میں رہتا ہے اور دل کو ہی اس کی خبر نہیں ہوتی کہ کب محبت ہوئی کب کسی کو اپنا بنا لیا کب کوئی وجہ زندگی بن گیا کب کوئی دل کے نہاں جانوں میں بس گیا اور ایسا بسا کہ نکالیں بھی تو کھرچ کر نکال نہ سکیں یہ دل پر آویزاں ہو جائے تو دل آویز لگے یہ دل پر چسپاں ہو جائے تو لوگوا سے دلچسپ کہیں دل میں در آئے تو دلدار بنے دل کو تکلیف ہو تو دلجوئی کرے دل مضطرب ہو تو دل لگی کرے کچھ عطا کرنا ہو تو یہی محبت دل نوازی کرے یعنی اس کا مسکن بھی دل اس کی مسند بھی دل اس کا گھر بھی دل اس کی سکونت بھی تیرا اور میرا دل! یہی محبت فطرت کی آنکھیں اور آنکھوں کی فطرت بدلنے والا معجزہ برپا کر سکتی ہے۔

یہی محبت اگر اپنی مسند سے بے توقیری کی حالت میں بے دخل ہو جائے تو صدیوں کی تعمیر پل بھر میں ملیا میٹ ہو جائے انسان بھی کیا عجب ہے محبت سے مصنوعات بناتا ہے محبت سے شہر پناہ تعمیر کرتا ہے شہر خوش خصال آباد کرتا ہے محبت سے آبادیاں بساتا ہے اور نو آبادیات کا دھندا کرتا ہے مگر محبت رخصت ہوتی ہے تو یہی انسان موضوعات خود ہی تباہ کرتا ہے۔ آبادیوں کو بھی یہی انسان ختم کرتا ہے محبتوں کی جگہ نفرتوں کے بیج بوتا ہے راقم کے اک کالم نگار دوست کہتے ہیں۔

،،لوگوں کی زندگی جہنم بنا کر راتوں کو سجدوں میں جنت تلاش کیوں کرتے ہو،،

محبت ہو تو بندہ کسی کے دل میں گھر کر جاتا ہے نہ ہو تو کسی کے دل سے اتر جاتا ہے کان میں روئی ٹھونس لینے سے نفرت بھری آواز آنا بند تو نہیں ہو سکتی اس کے تدارک کے لئے نفرت کے مجمع کو ختم کرنا ہوگا اور وہاں سے اس کان تک محبت کا پل تعمیر کرنا ہوگا یہی فارمولا حقیقی محبت والے جذبوں میں بھی کارفرما ہوتا ہے نفس پرستی کی محبت اور محبت کی نفس پرستی دونوں ہی عشق حقیقی پر ضربت کاری ہیں اس لیئے جان لیں کہ محبت کی زندگی یہی زندگی کی محبت سے یعنی صاحب دل اور صاحب حال کو اگر محبت کی طاقت یا طاقت کی محبت مل جائے تو بھی وہ متکبر نہیں ہوگا نا ہی نفرت کو رواج دے گا اور ایسا اسکی فطرت پر منحصر ہے فطرت سعید ہوگی تو محبت ہی محبت ہوگی کیونکہ فطرت کی آنکھیں اور آنکھوں کی فطرت بدل تو نہیں سکتی اور فطرت سلیم ہو تو کیا جواب ملتا ہے وہ آپ کی دلستگی کے لئے سناتا ہوں۔ اپنے صاحب دل دوست سے پوچھا

،،گھر میں ناچاقی تو نہیں رہتی؟

وہ محبت بھرے لہجے کی مٹھاس لئے بولا،، بیوی بچے تو ہیں ہی اپنے میں تو کوشش کرتا ہوں میری گلی کے خاکروب کو بھی مجھ سے کوئی تکلیف نہ ہو،، میں نے سوچا محبت واقعی فاتح عالم ہے۔

☆☆☆☆☆

[بنیادی نوٹ] بحث برائے اُردو ادب اور نقاد کی موت

آج سے تقریباً 80 / 70 سال پہلے کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ کوئی شخص کسی شعری یا نثری تخلیق کو پرکھے یا اس میں بیان کردہ نکتے کو نئی تفہیم کے ساتھ بیان کرے گا۔ اس زمانے میں لوگ تخلیق کو سنتے تھے اور تخلیق کار کو ایک دانشور اور اپنے معاشرے کا بہترین فرد سمجھتے تھے، اور اس سے راہنمائی حاصل کرتے تھے۔ یوں تخلیق شاعری ہو یا افسانہ، اصلاحی مضمون ہو یا داستان یہ ہنر سفر کرتا کسی انجانی خوشبو کی طرح لوگوں کو مہکاتا گزرتا تھا۔ پھر 1935 کے قریب غالب، اقبال، ذوق، سودا، میر انیس، مرزا دبیر کے فن پاروں پر علمی ادبی بحث کے نام سے کچھ کام شروع ہوا۔ اس زمانے میں مولوی عبدالحق، نیاز فتح پوری، سجاد ظہیر، احتشام حسین، اختر حسین رائے پوری اور کچھ دیگر اہل قلم بھی اس صف میں شامل ہو گئے۔

مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد نے علمی و ادبی بحث کو باقاعدہ تنقید کے سانچے میں ڈھالا، ترقی پسند تحریک سے متاثر تنقید نگاروں نے بہت خوبصورت اور مدلل تنقید لکھی، بعد میں نصابی نقادوں کی آمد ہوئی، کچھ نے غالب و اقبال پر لکھا، ایم اے پاس کیا اور تنخواہ لے کر گھر چلے گئے۔ کچھ نصابی اور روایتی تنقید نگاروں نے جو خود

اعجاز رضوی
فیصل زمان چشتی

کو بین الاقوامی سمجھتے تھے اور تحسین کو ہی تنقید کی بہن سمجھ کر ہر وقت اُسے گھر لے جانے کے چکر میں رہتے تھے۔ وہ خود تنقید اور تحسین کے فرق کو بیان کرنے سے قاصر تھے مگر اپنی انا کے تخت پر بیٹھ کر دوسروں کو بھی یہ حق نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ تنقید تحسین اور محض تحسین کا فرق بیان کریں۔ اور عوام الناس جو صرف سمجھانے پر ہی ادبی تخلیق کو سمجھتے ہیں یا پھر سمجھنے کے قابل ہوتے ہیں وہ بطور نقاد تخلیق کار کی زندگی اور اس کے تخلیقی کام کا موازانہ کرتے ہیں اور خاص طور پر اپنی پسند اور ناپسند کو سامنے رکھتے ہوئے تخلیق اور بعد میں تخلیق کار کو اپنی مرضی اور اپنے ڈھنگ کے مطابق عوام الناس کے سامنے پیش کر دیتے ہیں کہ یہ ہے شاعر ادیب اور یہ اسکی شعری یا نثری تخلیق ہے نظریہ کیا ہے اور اس نظریے کو اپنانے اور رد کرنے کے کیا کیا نقصانات یا ثمرات ہیں، اس سے نقاد عظیم بالکل بے خبر ہوتا ہے۔

اسی بے خبری کی وجہ سے ہمارے نقاد نے کبھی یہ زحمت ہی گوارہ نہیں کی کہ ان حالات کا جائزہ بھی لے، جن حالات میں تخلیق کار زندگی بسر کر رہا ہے اور ان زمینی حقائق کو بھی سمجھے جن کو مدنظر رکھتے ہوئے تخلیق کار کوئی تخلیق سامنے لاتا ہے۔ اس صورت حال کو سمجھنے کے لیے نقاد کا صاحب مطالعہ ہونا انتہائی ضروری ہے اور مطالعہ بھی اُن شرائط کے ساتھ کے نقاد ہر نئی شعری یا نثری تخلیقات کا 365 دن مطالعہ کرتا رہے کہ نیا لکھنے والا اپنے زمانی اور مکانی امکانات کے ساتھ کس لب و لہجے میں بات کر رہا ہے اور اس کا ویژن کس حد تک ہے، اور اس کے بعد وہ تخلیق کار کی زندگی اور مشکل حالات کا تجزیہ بھی دانش مندانہ انداز سے کر سکتا ہو۔ صرف ایک تخلیق یا صرف ایک شخصیت پر ہی لکھنا اور لکھتے چلے جانا ہی نقاد کی موت کا سبب ہے، علامہ اقبال ہوں یا مرزا اسد اللہ خان غالب ہمارے نام نہاد نقاد نے ان دو بڑے شاعروں پر لکھ کر ہاتھ صاف کیا اور نام بھی کمایا۔ اور پھر سب نقادوں نے مل کر ایک دوسرے کی نقل ماری، اور پھر نہا دھو کر پھر انھیں پر لکھنے بیٹھ گئے۔ اور یہ کام آج تک جاری و ساری ہے اور تا قیامت جاری رہے گا کہ مخصوص زبان اور مختلف جعلی فارمولے بنا کر اور اُن کو ہی ساختیاتی پس ساختیاتی نفسیاتی، عمرانیاتی، جبریاتی طبیعاتی مابعد الطبیعاتی کا نام دے کر لکھتے جانا اور خود ہی سر دھنتے جانا کسی طور پر قابل فخر عمل نہیں ہے، سو جناب عالی، آج ہم جس نصابی نقاد کی موت کے بعد اس کی فاتحہ خوانی میں شریک ہیں یہ وہی صاحب ہیں جو اپنے ایک نصابی مضمون کے سہارے لاتعداد مضامین کے

مالک و مختار بنے بیٹھے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ جس شاعر ادیب پر میں نے نہیں لکھا وہ شاید ادبی دنیا سے انتقال فرما چکا ہے۔ مگر محترم (مرحوم) نقاد صاحب، آپ کا یہ نظریہ بغیر کسی اضافت کے اپنی موت آپ بلکہ آپ سمت مر چکا ہے اور سوشل میڈیا کی دنیا میں آپ جیسے لاکھوں نقاد مارے مارے پھر رہے ہیں۔ شاعر ادیب جو بنیادی طور پر تخلیق کار ہے، اور اپنی دانش اور وجدان سے جو کچھ فن پارے تخلیق کرتا ہے وہ آپ جیسے کسی نقاد تحسین کار تقسیم کار ماہر لسانیات کے پورے پورے مقالے اور اُن مقالوں کے مجموعے پر سوفی صد بھاری ہے نقاد محترم آپ وہ روحانی سکون حاصل نہیں کرسکتے جو ایک ادنیٰ شاعر ادیب حاصل کرتا ہے اور تا دیر ایک سرور اور سرمستی کی کیفیت سے حس اُٹھاتا ہے، سو ہمیں آپ کی ناگہانی موت پر کوئی غم نہیں ہے۔ تخلیق کاروں کو یقین ہے کہ آپ کی رخصت سے کوئی خلا پیدا ہوا ہے نا ہی ہوگا، کہ کسی تخلیق پر تحسین یا اس کے انداز بیان پر تنقید کوئی تخلیق کار ہی کرسکتا ہے، ویسے تخلیق کسی بھی تنقید یا نقاد نما شخصیت کی محتاج نہیں ہے، سو آپ رخصت ہو گئے خوشی ہوئی۔

آخر میں چند شعر نقاد کی رحمت پر:

تنقیدی کی موت ہوئی
کج فہمی نے مار دیا
فارمولے کا قیدی تھا
کھلی فضا نے مار دیا
اک تخلیق سنائی تھی
اس نے جیون ہار دیا

....

سو محترم حاضرین حلقہ ارباب ذوق پاک ٹی ہاؤس، آپ کی آمد کا شکریہ، اب آپ کو اختیار ہے کہ آپ میرے اس بنیادی نوٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے بحث کا آغاز فرمائیں۔ اور جو کہنا چاہتے ہیں کہیں۔

محترم حاضرین! آپ نے اعجاز رضوی صاحب کا بنیادی نوٹ سماعت فرمایا، یقیناً یہ بنیادی نوٹ ہمارے آج کے مباحثے کا عنوان ہے۔ اور ہمارے آج کے صدر جناب پروفیسر شفیق احمد خان ہیں اور شریک گفتگو جناب ڈاکٹر ایوب ندیم اور معروف شاعر فرحت عباس شاہ ہیں۔ ہمارا آج کا موضوع نقاد کی موت ہے اور اسی سلسلے میں اعجاز رضوی نے بنیادی نوٹ پیش کیا۔

موضوع پر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے ممتاز شاعر ادیب اور دانشور فرحت عباس شاہ نے کہا کہ اس حلقہ کے سیکرٹری علی نواز شاہ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے آج کے اہم ترین موضوع کا انتخاب کیا اور میں سمجھتا ہوں کہ حلقہ ارباب ذوق کو ایسے مباحثے اور مکالمے کراتے رہنا چاہیے

تاکہ ہم جس عہد میں رہ رہے ہیں اس کی ادبی صورتحال کیا ہے۔ عوام الناس کو معلوم ہو کہ آج کا موضوع اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اصناف میں تعطیل آجاتا ہے کبھی شاعری رواج پا رہی ہوتی ہے اور کبھی افسانہ کا بول بالا ہوتا ہے اور ایک سے ایک طاقتور ناول افسانہ سامنے آتا ہے پھر پتہ چلتا ہے کہ مشاعروں کا شور وغل برپا ہو گیا ہے۔ ادیب تاریخ کو ترتیب بھی دے رہے ہوتے ہیں اور تحریر بھی کر رہے ہوتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ یہی لگا ہے ہمیشہ غیر جانبدار ترین تاریخ ادب کی ہی ملتی ہے ورنہ شاہوں کی لکھوائی ہوئی تاریخیں یا کسی خاص نقطۂ نظر کی حامل تاریخیں عام طور پر ملتی ہیں۔ جینوئن ادیب غیر جانبدارانہ صورتحال کو بیان ضرور کر جاتا ہے۔ افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ تنقید عرصہ دراز سے چند نصابی دائروں سے آگے نہیں بڑھ رہی ہے۔ اور چند ناولز اور افسانوں کے ذکر سے آگے نہیں بڑھ رہی ہے اور چند مخصوص سفرناموں سے آگے بات نہیں بڑھ رہی ہے اور اگر اس قحط میں اگر کوئی اچھا تخلیقی کام سامنے آتا ہے تو نقادوں کے ہاں ایک موت آسا خاموشی نظر آتی ہے اگر عام روٹین سے ہٹ کر اور مشاعروں کو خود لذتی سے ہٹ کر کوئی کتاب سامنے آتی ہے تو نقاد کی خاموشی سامنے نظر آرہی ہوتی ہے افسانہ یا مقالہ کہیں اچھا نظر آتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ جو یونیورسٹیوں میں تھیسز کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سامنے ہے۔ اچھا تھیسز سامنے آجانا چاہیے تاکہ اس کی قدر و منزلت اور وقار میں اضافہ ہو۔ پچھلے دس سالوں میں اگر کوئی معتبر تھیسز سامنے آیا ہے جو ایم فل کے حوالے سے ہے تو وہ جمیل احمد عدیل صاحب کا ہے اور ڈاکٹر غافر شہزاد کا نیا ناول جو آیا ہے وہ پڑھا ہے اس کے اوپر میں نے بھی لکھا ہے میں باقاعدہ نقاد تو نہیں ہوں لیکن جو مجھے سمجھ آیا ہے میں نے بات کی ہے۔ شفیق احمد خان اور فیصل زمان نے لکھا ہے اور بھی لوگوں نے لکھا ہے لیکن اس میں تخلیق کار سامنے آئے ہیں۔ سقہ نقاد کی خاموشی ہے اور جتنا کام ہو رہا ہے اس سے لگتا ہے کہ نقاد مر چکا ہے اور حلقہ ارباب ذوق نے اس موضوع کا انتخاب کر کے اس کی موت پر مہر ثبت کرنے کی کوشش نہیں ہے بلکہ اس کو زندہ کرنے کی کوشش اور خواہش ہے۔ نعمان منظور صاحب نے بھی ایک کتاب خالد احمد صاحب کے حوالے سے لکھی ہے اس میں مَیں پڑھ رہا تھا کہ خالد احمد صاحب بھی ڈھونڈ رہے تھے کہ نقاد کہاں چلا گیا ہے۔ یہاں تو ٹارگٹڈ اور فیڈ کام ہوتا ہے بے لوث کام نہیں ہو رہا ہے۔

نقاد کا رول بہت اہم ہوتا ہے۔ یا پھر تنقید کا باب ہی بند کر دیں اور پر صرف نوکریوں کے لیے اپنا قلم اٹھائیں اگر نقاد بے لوث اور خلوص سے کسی ادبی فن پارے کا جائزہ لے اور نئے لکھنے والوں کی رہنمائی کرے تو طالب علموں کی راہنمائی ہوتی ہے ان کو ایسا مواد ملتا ہے جس سے ادبی راہنمائی ملتی ہے اس لحاظ سے بھی یہ سمجھتا ہوں کہ آج کا موضوع نہایت اہم ہے۔ آج کے اجلاس میں انتہائی اہم ادیبوں اور مشاعروں کی شرکت اس کی اہمیت کا پتہ دے رہی ہے اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ آج کے اجلاس کی گونج پوری دنیا میں سنائی دے گی۔

اس کے بعد ہمارے کی نوٹ سپیکر پروفیسر ڈاکٹر ایوب ندیم نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں آج حلقہ ارباب ذوق کو مبارکباد ہوں کہ انھوں نے انتہائی اہم موضوع کا انتخاب کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم اس وقت یا مشاعرہ مشاعرہ کھیل رہے ہیں یا تنقیدی تنقیدی نشست کھیل رہے ہیں یہ ایک وقت میں ضرورت تھی۔ مگر اب حالات بدل گئے ہیں تقاضے بدل گئے ہیں اور ہماری ادبی ضروریات بھی بدل گئی ہیں اور حلقہ ارباب ذوق نے علی نواز شاہ کی سیکرٹری شپ میں اس نشست کا انتخاب کر کے ایک ایسے موضوع پر دستک دی ہے جو آج کی ضرورت ہے۔ سچائی سے جڑا ہوا ہے۔ خلوص وہ ہوتا ہے جہاں سچائی ہو غلطی کی نشاندہی کی جاتی ہے اور نقاد رہنما ہوتا ہے نقاد اس سمت کا تعین کرتا ہے کہ ہم نے کس طرف جانا ہے۔ اور اسی طرح تخلیق کار نقاد کی رہنمائی کرتا ہے کہ یہ آپس کا بڑا گہرا رشتہ ہے ارسطو نے جب یہ بتایا ہے کہ رجزیہ نظم کے تین حصے ہوتے ہیں آغاز، نفسِ مضمون اور نتیجہ۔ تو کہاں سے لیا اس نے۔ ارسطو کو نہیں پتہ تھا کہ نظم کیا ہوتی ہے اور اس کے کتنے حصے ہوتے ہیں اس نے ہومر کی نظموں سے یہ سب لیا۔ اس نے ہومر کی نظمیں پڑھیں تو اس کو پتہ چلا کہ نظم کے تین حصے ہوتے ہیں اور وہاں سے اس نے نظم کے تین حصوں کا تعین کر لیا۔ تنقید کا کام ہی کھوٹے اور کھرے کی پہچان ہے اگر وہ پہچان نہیں کرائی تو اس کا مقصد فوت ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ہمارے ہاں تنقید کا وجود نہیں ہے۔ تنقید تین کام کرتی ہے پہلا فن پارے کی تشریح و توضیح کرتی ہے دوسرا اس کے محاسن اور معائب کو بیان کرتی حکم اور ثالث کا کردار ادا کرتا ہے۔ اور تیسرا کام اس فن پارے کے مرتبے کا تعین کرتی ہے۔ ہم ذاتی کدورتیں تنقید کے ذریعے نکالتے ہیں ایک وقت تھا جب حلقہ ارباب ذوق مجلسی تنقید کا آغاز کیا اس وقت اس کی

ضرورت تھی اس لیے کہ ہمارے ہاں عملی تنقید موجود نہیں تھی۔ میراجی نے تجویز پیش کی تھی کہ حلقے میں تخلیق پر تنقید بھی کی جائے۔ اس وقت بھی سارے ادب اور شاعر پریشان ہو گئے تھے اور اس سے پہلو تہی کرنے کی کوشش کی گئی اور سب سے پہلے یوسف ظفر نے اپنی نظم تنقید کے لیے پیش کی اور ایک نئے سلسلے کا آغاز ہو گیا۔ اس وقت تنقید ذات سے بالا ہوتی تھی ہدف صرف تخلیق ہوتی تھی تخلیق کار نہیں۔ اس لیے اس وقت کے ادیبوں اور شاعروں کے آپس میں تعلقات خراب نہ ہوئے۔ حالی کی تنقید، نظری تنقید ہے وہ عملی تنقید نہیں ہے وہ صرف نظریے کو لرج نے تنقید کے حوالے سے کام خراب کیا اس نے کہا کہ ادبی فن پارے کے مقام کا تعین کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فن پارے صرف محاسن بیان کیے جائیں معائب بیان نہ کیے جائیں اور نہ ہی ہر بات کی جائے۔ اور اس بنیاد کو ہمارے نقادوں نے بھی گلے سے لگا لیا۔ قلیپوں اور دیباچوں کی بھرمار ہو گئی توصیفی کلمات کی حد نہیں کہیں کہیں تشریح نہیں ہوتی کہیں توضیح نہیں ہوتی۔ حمایت کی وجہ نہیں لکھی جاتی ہے۔ کچھ مخصوص جملے ہیں جو چبائے جاتے ہیں اور پوری ادبی دنیا میں گردش کرتے ہیں۔ تنقید کہاں سے کی جائے گی اور پھر ایسے مباحثے نقاد کی موت ہوتے رہیں گے۔ ایک حقیقی تخلیق کار کی تخلیق میں اس کا عہد نظر آتا ہے اس کی تہذیب اور معاشرت نظر آتی ہے۔ آپ مدرسانہ تنقید پر انگلی اُٹھاتے ہیں تو غیر مدرسانہ تنقید نے کونسا تیر مار لیا ہے۔ دونوں طرف ایک جیسا حال ہے فرق یہ ہے کہ مدرسانہ تنقید زیادہ لکھی جا رہی ہے اور غیر مدرسانہ کم لکھی جا رہی ہے۔ اس وجہ سے غیر مدرسانہ تنقید پر کم بات ہوتی ہے۔ ادیب اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے اور اصل مورخ بھی وہی ہوتا ہے غالب اور اقبال کے خطوط سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے۔ کسی دباؤ اور لالچ کے بغیر لکھ رہا ہوتا ہے اس لیے اصل اور حقیقی بات کی عکاسی کرتا ہے شاعری کی ہر سال سینکڑوں کتابیں چھپتی ہیں اور تنقید کی صرف دو چار کتابیں اور وہ تنقید بھی ایسی جس پر ہم اعتبار نہیں کر سکتے۔ اگر ہم نے نقاد کو دوبارہ زندہ کرنا ہے تو ہمیں قابل اعتبار تنقید لکھنا پڑے گی اس کی بات دلائل اور روشنی میں کرنا ہو گی تا کہ تعلقات کی بنیاد پر لالچ کی بنیاد پر تخلیق تنقید نہ ہو عصری حسیت ہو معاشرت ہو تہذیب ہو آفاقی اور اپنے صحیح خطوط پر استوار ہو اور نقاد اپنے پرانے منصب پر براجمان ہو واپس آئے تو نقاد دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے۔ آجکل تنقید کو

تفتیش سمجھ لیا گیا۔ جبکہ ایسا نہیں ہوتا۔ تخلیقی مقالے کو سپر وائزر بھی پڑھنے کی زحمت نہیں کرتا کیونکہ اس کو پتہ ہوتا ہے پیپر تو مجھے مل ہی جانا ہے ہمارے ہاں معیارات اور ترجیحات تبدیل ہو چکی ہیں۔ ہمیں تنقید کو زندہ کرنا ہے اگر یہ زندہ نہیں ہوتی تو تخلیق معیاری سطح کی نہیں ہوگی اور ہمیں یہ حوصلہ بھی پیدا کرنا ہو گا اگر کوئی صحیح Anyleseis کرتا تو ہمیں ہنس کر قبول کرنا چاہیے۔

اس کے بعد پشاور سے تعلق رکھنے والے نوجوان شاعر اور محقق نذیر ساگر نے نقاد کی موت کے موضوع پر اپنا ایک خصوصی مضمون لکھ کر بھجوایا جس میں انھوں نے کہا کہ ''بعض چیزوں کی تشریح اپنے متضاد چیزوں سے ہوتی ہے جب ہم موت کا لفظ سنتے ہیں تو زندگی کا خیال آتا ہے کیونکہ موت زندہ چیزوں کی واقع ہوتی ہے جب ہم نقاد کی موت کی بات کرتے ہیں تو اس سے اتفاق کرنا قدرے مشکل نقاد کبھی زندہ بھی تھا جو اب مر گیا۔ اگر ہم اردو تنقید کے ارتقائی سفر پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں ابتدا تذکروں کی صورت میں ملتی ہے۔ تذکرے اگرچہ مکمل تنقید کے زمرے میں نہیں آتے لیکن میرے نزدیک ہمارا نام نہاد تنقید کے مقابلے میں اس لحاظ سے تذکرے معتبر ہیں کہ ایک تو وہ فن کاروں نے خود لکھے اور دوسری خاص بات ان کی یہ ہے کہ تذکروں میں کسی مستعار نظریے کے بجائے تخلیق کاروں نے اپنے تاثرات قلمبند کیے ہیں۔ جہاں تک جدید تنقید کی بات ہے تو اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جدید تنقید حالی سے شروع ہو کر حالی پہ ہی ختم ہوئی ہے۔ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ گئے کہ اردو تنقید آج بھی حالی سے آگے نہیں بڑھ سکی ہے۔ ایک یہ بھی شوشہ چھوڑا جاتا ہے کہ اچھا نقاد اچھا فنکار نہیں ہوتا اور اچھا فنکار اچھا ناقد نہیں ہوتا اس بات کو تسلیم کرنا مشکل ہے کیونکہ عظیم فن پارے کے لیے عظیم تنقیدی شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ اچھے ناقدین بھی ہمارے ہاں حسن عسکری، وزیر آغا، جیلانی کامران، وقار عظیم، سید اللہ، کلیم الدین احمد کی شکل میں موجود تھے لیکن کیا ان کی تنقید کو زندہ تنقید کہا جا سکتا ہے۔ میں بذات خود ان کی تنقید کو اردو تنقید کے ارتقائی سفر میں اہم تو سمجھتا ہوں لیکن زندہ رہنے کی یقین دہانی نہیں کرا سکتا صرف حسن عسکری ایک ایسے ناقد ہیں جنھوں نے نظریہ سازی کی کوشش کی اور کسی حد تک کامیاب بھی رہے۔ لیکن مغربی اثر سے وہ بھی نہ نکل سکے۔ جب جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات پس

ساختیات تانیثیت جیسے کئی جدید رجحانات نے جنم لیا تو ہمارے ناقدین جو پہلے ہی مستعار نظریوں پر تنقید کی عمارت کھڑی کرتے تھے اب حرف بہ حرف مغرب کی نقل کر کے کتابوں کے ڈھیر لگاتے گئے۔ ایسے ناقدین میں گوپی چند نارنگ اور ناصر عباس نیر جیسے اہم نام بھی شامل ہیں اس لحاظ سے اگر جدید دور میں نقاد کی موت کا اعلان ہوا ہے تو بالکل بجا ہوا ہے میرا تو موقف یہ ہی ہے کہ نقاد نہ ماضی میں زندہ تھا نہ آج زندہ ہے لیکن اگر ماضی کے ناقدین کو اردو تنقید کی مختصر تاریخ کے سبب رعایت دی جائے تو یہی کہا جا سکتا کہ ماضی میں ہمارا نقاد نیم جاں تھا اور آج بے جان ہو گیا ہے۔

اس کے بعد سیکرٹری حلقہ علی نواز شاہ نے مختصراً کہا کہ آج اگر تنقید کی یہ حالت ہوئی ہے تو میرے خیال میں اس کے ذمہ داران میں کالج اور یونیورسٹیاں سرِ فہرست ہیں یہ علمی درسگاہیں ہیں جہاں پر تعلیم دی جاتی ہے اور معیارات کا خیال رکھا جاتا ہے یہ ان درسگاہوں اور اس کے کرتا دھرتا پروفیسر صاحبان کی کلیدی ذمہ داری میں آتا ہے کہ وہ تنقید اور اس کے معیارات کا خیال رکھیں اور ایسے نقاد پیدا کریں جو کل کو ہمارا اثاثہ ثابت ہوں جو بغیر کسی لالچ، اقربا پروری، یا بغض میں بلاتفریق تخلیق کاروں کے فن پاروں کے محاسن و معائب کو بیان کر کے تخلیق کاروں کی رہنمائی بھی کریں اور تنقیدی قد بھی اونچا کریں۔

اس کے بعد تاثیر نقوی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ نقادوں کو گروہ بندیوں سے بالا ہو کر خالصتاً ادب کے بارے میں سوچنا ہوگا اجارہ داریوں کو ختم کرنا ہوگا۔ ایماندرانہ اور صحتمندانہ تنقید کو رواج دینا ہوگا تاکہ تخلیق کار کے فن پارے غیر جانبدارانہ مقالہ جات لکھے جائیں۔ اور تخلیق کار کا نقاد پر اعتماد بحال ہو اور اس کی راہنمائی بھی ہو کیونکہ نقاد اور تخلیق کار کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے یہ دریا کے دو کنارے ہیں جو ساتھ ساتھ چلتے ہیں اگر نقاد گروہ بندیوں سے باہر نکل کر تنقید لکھے گا تو اس سے تخلیق کار کا معیار خود بخود اوپر آتا چلا جائے گا اور ہمارا ادب نئی راہوں پر چل نکلے گا۔

مباحثہ میں مزید بات کرتے ہوئے ممتاز شاعر فرحت عباس شاہ نے کہا کہ مکالمہ بڑے دلچسپ مرحلے میں داخل ہو چکا ہے۔ خیال ہے کہ کسی نقاد کی طرف سے کسی تخلیق کے معائب اگر بغیر کسی تعصب کے اُجاگر کیے گئے ہوں تو کمزور تخلیق کار تو غصہ کرے گا لیکن جو ایک طاقتور تخلیق کار ہیں وہ اس بات کا کبھی برا نہیں مناتے مثال کے طور پر پچھلے دور میں ڈاکٹر انیس ناگی ان پر کسی نقاد کو کام کرنے کا خیال آیا پروفیسر صاحبان

ہی نے زحمت کی ہے۔ انھیں مسلسل نظر انداز کیا گیا ہے وہ بغیر کسی تعصب کے محاسن و مصائب اجاگر کرنے والے نقاد تھے۔ اتنا بے دھڑک اور دلیر نقاد اردو ادب میں موجود نہیں ہے تو پتہ چلا کہ ان سے ناراض ہونے والوں میں اکثریت ناقدین کی ہے جو ان پر کام کرنے کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ یہ بد دیانتی نقادوں اور مدرسین کی طرف سے ہو رہی ہے اور اللے تللے تھسیز پر ڈگریاں دی جا رہی ہیں۔ شاہین مفتی نے ان پر ایک مقالہ لکھا جو اسی حلقہ ارباب ذوق میں پیش کیا گیا اس میں ان کے معائب کے ڈھیر لگا دیئے۔ ناگی صاحب بھی سامنے موجود تھے۔ سب لوگوں کا خیال تھا کہ لڑائی لازمی ہو گی لیکن ناگی صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا کہ شاہین مفتی تم نے کمال کر دیا تم نے پڑھ کر اور حوالے دے کر بات کی ہے اگرچہ میں کچھ چیزوں سے متفق ہوں اور کچھ سے نہیں ہوں لیکن بہت اعلیٰ مضمون ہے۔ ایک اور مثال حال ہی میں ڈاکٹر غافر شہزاد کا نیا ناول ''کرول گھاٹی'' آیا ہے۔ میں نے ان سے بات کی ہے کہ میں آپ کے ناول پر لکھنا چاہتا ہوں انھوں نے کہا کہ بسم اللہ لکھیں۔ شفیق صاحب نے ان کے ناول کے بارے میں کچھ باتیں کیں کہ اب کو ایسا ہونا چاہیے تھا انھوں نے کبھی برا نہیں منایا بلکہ خوشی کا اظہار کیا انھوں نے تو تنقیص بھی خندہ پیشانی سے قبول کی کہ کم از کم کام تو ہو رہا ہے یہ وہ رویہ ہے جو اردو ادب کو عروج پر لے جائے گا۔ آج کا نقاد جینوئن تخلیق پر لکھنا ہی نہیں چاہتا بلکہ اس پر لکھتا ہے جس سے اس کو فائدہ ہو اس کے تعلقات استوار ہوں شفیق صاحب کی ایک نظم ''کون عربوں سے کہے'' اتنی قد آور تخلیق ہے کہ پوری دنیا میں اس کی بات چل رہی ہے لیکن کسی نقاد کی طرف سے اس پر کوئی تبصرہ یا مقالہ سامنے نہیں آیا۔ کرول گھاٹی موجودہ نظام کی دھجیاں اُڑاتا ہوا ناول ہے لیکن کسی نقاد کو اتنی توفیق نہیں ہوئی کہ اس پر بات کرے۔ میری کتاب ''مزاحمت کریں گے ہم'' عصرِ حاضر کی شاعری ہے۔ میں نے اس کو عصرِ حاضر سے ٹیگ کیا ہے لیکن نقاد کہاں ہے کسی کو نہیں معلوم میں نے اُٹھائیس سال پہلے نعرہ لگایا تھا کہ تخلیقی تنقید کریں۔ نہ ناگی صاحب پر کوئی کام نہ میری کتاب پر کوئی بات میں کہتا ہوں میرے خلاف لکھیں کچھ ہوتا تو نظر آئے کوئی کام تو ہو لوگوں کی یہ ذہنیت ہے کہ اگر ہم کسی تخلیق پر لکھیں گے تو اس کی اہمیت بڑھ جائے گی اس کا قد بڑھ جائے گا اتنا تعصب اور تنگ نظری ہے۔ نقاد تخلیق کی وجہ سے زندہ ہوتا ہے۔ میرے خیال میں اگر نقاد دوبارہ اپنے منصب پر

نہیں بیٹھے گا تو وہ مرتا ہی رہے گا۔ مباحثے میں بات کرتے ہوئے معروف شاعر و ادیب و ناول نگار ڈاکٹر فافر شہزاد نے کہا کہ اب تک بہت اچھی باتیں ہو چکی ہیں اور کافی پہلوؤں پر اظہارِ خیال ہو چکا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب تک تخلیق کار کے اندر نقاد موجود نہیں ہوگا وہ اچھا تخلیق کار ہو ہی نہیں سکتا۔ ہمارے ہاں المیہ یہ ہے کہ جو تخلیق کار کا کوئی ضابطہ ہی نہیں انھیں پتہ ہی نہیں کہ میں نے کیا کہنا ہے اور کیا نہیں کہنا جب غیر نظریاتی لوگ تخلیق کے میدان میں آئیں گے تو ایسا ہوگا۔ تخلیق کار کو پڑھا لکھا ہونا چاہیے اس کو زندگی اور کائنات کے دیگر علوم کا بھی پتہ ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں نقاد یا تخلیق کار کو ان باتوں کا پتہ ہی نہیں۔ تنقید تخلیق کار کو سنوارتی ہے اُسے بتاتی ہے کہ آپ کہاں کھڑے ہیں تخلیق کار اگر تنقید کو سننے کا حوصلہ رکھتا ہے تو اس کا معیار بہتر سے بہتر ہوتا چلا جائے گا۔ ادبی بددیانتی اور ادبی گروہ بندی نے تخلیق اور تنقید دونوں کو بہت نقصان پہنچایا ہے اصل بات یہ ہے کہ میرا اپنا ناول کرول گھائی اس پر کسی نقاد نے بات نہیں کی میرا خیال ہے کہ یہ ناول ابھی تک ان کی سمجھ میں ہی نہیں آیا۔ سلیم الرحمٰن جیسا بندہ کہہ رہا ہے کہ ان ناول کی کہانی ہی نہیں ہے یعنی اندازہ آپ خود لگالیں۔ اگر سلیم الرحمٰن کو کہانی نظر نہیں آ رہی ہے تو ہم تو صرف ماتم ہی کر سکتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ناول کے اندر ہیروئن ہی نہیں ہے۔ اصل کہانی یہ ہے کہ کچھ عرصہ پہلے انھوں نے ایک انگلش ناول کا اردو ترجمہ کیا میں نے اس ناول کے حوالے سے تنقیدی جائزہ پیش کیا بہرحال ترجمہ انھوں نے اچھا کیا تھا انھوں نے اس سات کو سامنے رکھ کر باتیں کیں تھیں مجھے سمجھ آ گئی۔ بنیادی طور پر وہ کر کیا رہے ہیں۔ اس کے بعد شمس الرحمٰن فاروقی کا ایک ناول قبض زمان ہے جس کے بارے میں بڑا شور شرابا ہے کہ پتہ نہیں کیا بلا ہے بلکہ سیدھے میں نے اس کا پوسٹ مارٹم کر کے فیس بک پر لگا دیا پھر کافی سارے لوگوں کو کافی تکلیف ہوئی۔ وہ ایک ڈیڑھ صفحے کی حکایت تھی پھیلا کر سو صفحے کا ناول بنایا اور آخر میں انھوں نے اس حکایت کا حوالہ بھی دیا ہے۔ مجھے پتہ ہے کہ میرا ناول کیا ہے اور اس کی طاقت کتنی ہے وہ آنے والے وقت اپنا آپ منوائے گا وہ بتاتا ہے کہ اکیسویں صدی کا ناول کیسا ہوتا ہے اس کی کئی تہیں ہیں۔ اگر نقادوں نے طے شدہ ضابطوں میں رکھ کر نئی تخلیقات کو دیکھنا ہے تو نئی تخلیقات کہاں کھڑی ہوں گی۔ مزاحمت کریں گے ہم کو کس ضابطے میں رکھ کر دیکھیں گے۔ نئی سوچ نئے نظریے

پورے ضابطے بنانے ہوں گے تب جا کر بات بنے گی۔ نقاد تخلیق کار کو بتائے جو تخلیق کار کو بھی نہ پتہ ہو۔ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جس سے عہدہ برا ہونا بہت ضروری ہے۔ آخر میں صاحب صدارت پروفیسر شفیق احمد خان نے اپنے صدارتی خطبے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہا کہ اگر ہم اردو زبان و ادب میں تنقید کے آغاز و ارتقا کو دیکھیں تو ابتدائی شکل میں تذکرے ملتے ہیں جیسے گلشنِ بے خواب وغیرہ شامل ہیں۔ یا مشاعرے کی روایات بھی شامل ہیں جہاں سامنے والا بہت تیز تھا اور ان کی داد کی نوعیت فیصلہ کرتی تھی کہ کس قسم کی شاعری سنائی گئی ابتدائی شکل تو یہ تھی تنقید کی پھر اس کے بعد تین کتابیں جہاں سے کہاں جاتا ہے اردو تنقید کا آغاز ہوا۔ پہلی شبلی نعمانی کی شعر و انجم۔ دوسری حالی کے ہاں نظری مضامین ہیں اسی زمانے میں شبلی نعمانی کی کتاب موازنہ انیس و دبیر تو ہمیں محاکم اور عملی تنقید کی صورت بھی نظر آتی ہے۔ جب برطانوی ادارے ادھر آئے اور لوگوں نے انگریزی سیکھی اور انگریزی ادب سے واقف ہوئے تو لوگوں میں ایک اور طبقہ پیدا ہوا لکھنے والا۔ انگریز اور یورپ والے چونکہ ہم سے دو سال آگے تھے اس کے اثرات ہوئے اور جو تنقید لکھی گئی پھر وہ مختلف اصناف میں آئی وہ ناول تھا۔ افسانہ تھا، آزاد نظم تھی وغیرہ اس میں ہمیں تنقید کے نمایاں خدوخال دکھائی دیتے ہیں۔ اس زبان تک گروپ یا حکایت فکر تک ہی تنقید لکھی گئی۔ تاثر والی سطح بعد میں دکھائی دیتی ہے۔ پھر ایک ترقی پسند کی تحریک اٹھتی ہے اس کے نقاد اپنی تنقید کہتے ہیں اختر حسین رائے پوری ہوں، علی سردار جعفری ہوں، محمد علی صدیقی ہوں ان کا اپنا ایک زاویہ ہے ایک تنقید میں حلقہ ارباب ذوق کے لوگوں کی ہے۔ اس میں بہت کام بھی ہمیں دکھائی دیئے۔ اس میں ایورج کام بھی دکھائی دیتا ہے۔ تنقید کبھی بھی تخلیق کے برابر نہیں گئی۔ تنقید کو ہمیشہ دوسرے درجے پر ہی رکھا گیا۔ یہ کام انگریز کے آنے کے بعد ہوا یہ کام پورے اختلاف کے بعد شروع ہوا۔ اس میں ناول، افسانہ اور دیگر اصناف شامل ہیں۔ ایک طبقے نے کام بھی کیا ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے ۔ محمد حسن عسکری، ڈاکٹر وزیر آغا، ڈاکٹر انیس ناگی، محمد علی صدیقی، ممتاز حسین، مثال کے طور پر انیس ناگی نے ڈپٹی نذیر کے ناولوں کے کرداروں پر جو کام کیا جو ان کا نفسیاتی تجزیہ کیا۔ وہ بے مثال ہے اور انتہائی اہم ہے۔ وارث علوی نے منٹو اور بیدی کے اوپر جو کام ہے قابل تعریف ہے۔ تنقید میں دیباچوں

اور مقدموں کی شکل میں بڑا کام ہو چکا ہے۔ بعض اوقات اور بعض جگہوں پر درسی حوالے سے بھی اعلیٰ ترین کام ہو چکا ہے اب جو لوگ نقادرہ گئے ہیں ان کا کام انتہائی سطحی قسم کا ہے۔ ایک تو ذاتی تعلق کی بنا پر تنقید لکھتے ہیں کہ ہاں وہ مجھے کانفرنس میں بلا لیں گے ہوائی ٹکٹ بھیج دیں گے تین دن ہوٹل کا قیام ہو جائے گا ایک مقالہ لکھوں گا شاعری پہ دوسرا ذات پہ لکھ دوں۔ دوسری سطح یہ ہے کہ تنقید لکھنے والا سوچتا ہے کہ میں اس پر لکھوں جو مر چکا ہے۔ کسی اور بجنل تخلیق کار پہ نہ لکھوں مثال کے طور پر ن م راشد ہاں اچھا کام ہے اس پر ڈاکٹر آفتاب کی کتاب کے بعد GC والوں نے اس کے صد سالہ جشن پر چھ کتابیں چھاپیں۔ چار کتابیں پنجاب یونیورسٹی والوں نے چھاپیں ان سب کتابوں میں ڈاکٹر آفتاب کی کتاب سے آگے ایک بات بھی نہیں ہوئی اس سے کم درجے کی باتیں ہوئی ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اوورریٹڈ شاعر یا ادیب جو ہیں ان پر لکھ کر توجہ حاصل کرلوں گا جتنا کام ان پر ہو چکا کافی ہے ان کا انتخاب کرو جن پر کام نہیں ہو سکا ان رویوں نے بھی تخلیق کاری کو بہت نقصان پہنچایا ہے۔ ہمارے ہاں اکثریت تاثراتی اور جمالیاتی تنقید لکھنے والوں کی ہے۔ عمرانی نقطہ نظر ہمارے ہاں بہت کم رہا ہے۔ جب ہمارا نقاد مغربی تھیوری کو بہت سی چیزوں کو یہاں شاعر مزاج سے علمی خراج سے مشرقی مزاج سے زبردستی منطبق کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ سردرد کا باعث بنتی ہیں اور سنجیدہ پڑھنے والے ان کو رد کر دیتے ہیں۔ اس ساری صورتحال کا نتیجہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ مشاعرے کی روایت بڑی پرانی روایت ہے۔ آج سب سے زیادہ پیسے لینے والا شاعر انور مسعود ہے وہ ہمیں پچھلے پچاس سال سے بین سنا رہا ہے اور انارکلی دی شان بھولیے مجھے سنائی جا رہا ہے پتہ نہیں ان میں کیا افادیت ہے ایسے شاعر ہم پر سوار ہیں اور ایک برباد معاشرے کی مزید بربادی کا باعث بن رہے ہیں۔ یہ بھی ایک نقاد کا کام ہے کہ وہ اچھی شاعری کا بتائے اور اس کی افادیت اجاگر کرے اچھی شاعری اور اچھے موضوعات کے حامل ناولز کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ اور ان پر تنقیدی کام کیا جائے۔ اچھے تخلیق کار جو تنقیدی شعور رکھتے ہیں تو ان کو بھی تنقید لکھنی چاہیے تب ہی جا کر تنقیدی شعور پیدا ہوگا اور تنقید کا معیار بھی بہتر ہوگا۔ ہمارے ہاں جو تنقید کی روایت چلی آ رہی تھی وہ مجھے معدوم ہوتی نظر آتی ہے اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ہمارے ہاں ترسیل کے ذرائع بھی تبدیل ہو چکے ہیں۔ اور مجھے یہ لگتا ہے کہ جب تک تخلیق کار خود تنقید کا میدان نہیں سنبھالتا معالات ایسے ہی رہیں گے۔

☆☆☆☆☆

اولمپیا

ابدال بیلا

قلوپطرہ تمہیں جنگوں کی تو کہانیاں سنا دیں، امن دنوں میں کھیل کود میں جنگوں کا سا جنون نہیں سنایا۔ دیکھ قلوپطرہ ''انا'' کے دائرے میں بند بندہ ہو یا ریاست، یا کوئی ملک وہ ساتھ والوں سے ٹکراتا ہے۔ بہانہ کوئی نہ ہو تو بنالیتا ہے۔ خالی برتن، برتن سے ٹکرائے تو آواز آتی۔ وہی آواز خالی ''انا'' کے غبارے کو اڑائے رکھتی ہے۔

قدیم یونان کی شہری ریاستیں آپس میں چودھراہٹ کے چکر میں ایک دوسرے سے لڑتی رہتیں۔ کسی ایک ریاست نے دوسری ریاست کی برتری نہیں مانی۔

''اولمپیا'' میدان کے رکھوالے شہر ''ایلس'' کا بادشاہ اپنی برتری عجب طریقے سے منوانے پہ تلا تھا - اُس کی شہزادی ''ہپوڈیمیا'' نے اپنی خوبصورتی کے جادو سے چاروں طرف کہرام مچایا ہوا تھا۔

قلوپطرہ، یوں سمجھو، وہ اپنے دور کی قلوپطرہ تھی۔ یونان کی سبھی ریاستوں کے شہزادے من چلے اُس کو رام کرنے میں لگے تھے - شہزادی کے باپ ''ایلس'' ریاست کے بادشاہ نے اک انوکھی شرط رکھی ہوئی تھی۔ بادشاہ رتھ دوڑانے میں ماہر تھا، شرط اُس

نے یہ رکھی، کہ جو "شہزادہ" اُسے "رتھ" کی دوڑ میں ہرادے، وہ شہزادی لے جائے۔ نہ ہرا سکے جو وہ سن لے کہ وہ اپنی زندگی سے گیا۔ کئی من چلے آئے، بادشاہ کو نہ ہرا سکے، مارے گئے۔

بادشاہ نے چالاکی کی ہوئی تھی۔

اپنے رتھ کے پہیوں کے ایکسل سے باہر چھریاں تیز کر کے لگائی ہوئی تھیں۔ کانسی کی چھریاں پہیوں کے ساتھ گھومتی مخالف رتھ کے پہیوں کو کاٹ دیتی۔ مخالف کا رتھ دوڑتے دوڑتے گر جاتا، سوار مارا جاتا۔

بادشاہ فتح سے گردن اکڑا کے اپنا رتھ گھما کے، دیکھتی شہزادی کے پاس آ جاتا۔ لوگ پاگلوں کی طرح تالیاں بجاتے۔

لوگوں کا تو کام ہی تالیاں بجانا ہوتا، جانتی تم قلوپطرہ۔

"پیلوپس" کسی پڑوسی ریاست کا لڑکا تھا۔ شہزادہ تو وہ کسی ریاست کا نہ تھا، کسی بستی میں رتھوں کے پہیوں کو بنانے والا مستری تھا۔ اپنا رتھ تو اُس نے بنالیا، مگر شہزادی کے آگے پیچھے پھر کے اُسے رجھا لیا۔ پھر اُسی کی معرفت بادشاہ کے رتھ کی دیکھ بھال کرتے مستری سے جادوستی لگائی۔ رتھوں کی دوڑ سے پہلے اُس نے بادشاہ کے مستری کو رشوت دے کے، اُس کے رتھ کے ایک طرف کے ایکسل میں، پیتل کے لمبے پیچ کی جگہ موم بتی ٹھونسوا دی۔ بادشاہ اپنا رتھ لے کر "انا" کے پہاڑ پہ چڑھ کے رتھ دوڑاتا آیا، پہلے ہی چکر میں اُس کے رتھ کا ایک پہیہ لڑکھڑا کے باہر جا گرا، بادشاہ دوڑتے گھوڑوں کی ٹانگوں میں گرا مر گیا۔ "پیلوپس" ایک موم بتی سے شہزادی کے ساتھ "ایلس" ریاست کا تاج بھی جیت گیا۔

اب اُس کو مقابلوں کا شوق ہو گیا۔

رتھوں کے دوڑنے کا میدان تو تھا ہی، میدان کی جگہ "کوہ ایلفیس" کے نشیب میں دو دریاؤں "پیلوپونس" دریا اور دریائے "کلیڈیئس" کے درمیان کی سرسبز وادی تھی۔ کناروں پہ اونچے چھتناور درختوں کے جھنڈ تھے، خوشبوؤں سے بسی پھولوں کی جھاڑیاں تھیں۔ ساتھ ہی "آیونین سمندر" کا سہانا ساحل تھا۔ کنارے پہ اونچی مخروطی چوٹی والی پہاڑی "ماؤنٹ کرونوس" پہرے پہ کھڑی تھی۔ اُس کے کوئی اوپر چڑھ جاتا تو، آرکیڈیا کے پہاڑوں کا سلسلہ آ جاتا، جسے یونانی بہشت مانتے تھے۔

تم میں بھی یونانی خون، قلوپطرہ، تم بھی یہی مانتی، ہے نا؟

"اولمپیا" قدیم زمانے ہی سے، عبادت کی مانی ہوئی جگہ تھی۔ یونانی دیوتا "زیوس" کے اعزاز میں اُدھر تقریبات ہوا کرتی تھیں۔ روایت تھی کہ یونانی دیومالائی کہانیوں کے سب سے بڑے "زیوس" دیوتا نے ایک

نمائشی کشتی اپنے باپ ''کرونوس'' سے وہاں کی تھی۔ کشتی میں دونوں باپ بیٹے جیتے، ہارا کوئی نہ۔ کرونوس کے نام سے ہی اُدھر سر اُٹھائے پہاڑ کو نام دیا ہوا تھا۔ ''زیوس'' نے وہیں اپنے لاڈلے بیٹے ''اپالو'' دیوتا سے بھی کشتی لڑی تھی۔ اپالو کو جنگ کے دیوتا ''ایریس'' سے مکے بازی بھی کرائی تھی۔

اب ''اولمپیا'' کا میدان، شہزادی کو جیتنے والے ''پیلوپس'' کی دسترس میں تھا۔ وہ جو اپنے سسر والے رتھ کے ایکسل میں پیتل کا پیچ نکلوا کے موم بتی رکھوا سکتا تھا، اُس نے محل میں موم بتیاں جلا کے جگ مگ کیا ہوا تھا۔

ایسی جگ مگ، جیسے قلوپطرہ تم اپنے محل میں روز کرتی تھی۔

کرتی تھی نا؟

اب دیکھ کیسے معصوم پری بن کے مسکرا رہی ہے۔ دعوتیں بھی تم سب پڑوسی ملکوں کی کرتی تھی۔ بس تمہاری طرح اُس نے بھی یونان کی ساری شہری ریاستوں کے بادشاہوں کی دعوت کی، کہا، دیکھو، سال ہا سال سے ہم آپس میں لڑتے آ رہے ہیں، یوں کریں سال میں ایک مہینہ، ہر چار سال بعد، ہم امن کا رکھ لیتے ہیں۔ اُس دوران ہر ریاست کے اصل یونانی نسل کے نوجوان کھیلوں میں مقابلے کریں۔ اُس مہینے میں لڑائی جھگڑا ختم۔ پکا صلح نامہ طے کریں سب، اُس پہ پراضی ہوں تو میں، میزبانی کے لیے تیار۔

جگہ موجود

اس نے وہی دو دریاؤں کے درمیان، سمندر کنارے، اونچے پہاڑ کی نکر پر ''آلٹس'' جگہ پہ ''اولمپیا'' کا میدان اُن خیر سگالی کے مقابلوں کے لیے تجویز کیا۔ پہلا صلح نامہ پڑوسی ''پیسا'' کی ریاست سے ہوا۔

قلوپطرہ، یہ وہی ''پیسا'' شہر جہاں تم اُس کا اونچا مینار دیکھنے گئی تو وہ مینار تمہارے حسن کی چکا چوند دیکھ کے، تمہیں دیکھنے کو جھکا تو ٹیڑھا ہو گیا، اب تک ٹیڑھا ہی ہے۔ اُس کی بات کر رہا ہوں۔

ہولے ہولے دوسری ریاستیں بھی اُس میں شامل ہو گئیں۔

کھیلوں کے لیے مہینہ جولائی کا چنا گیا، جب سردی نہ ہوتی، سنہری دھوپ سہانی لگتی۔ ہر طرف لڑائیاں بند ہونے کا اعلان ہو جاتا، اور ہر شہر سے کھیلوں کو دیکھنے والے امڈ آتے۔

پہلے صرف دوڑ کا مقابلہ ہوا۔

''ایلس'' کا تیز رفتار جوان ''کوربیس'' جیت گیا۔ یہ مقابلے اولمپک کھیلیں کہلانے لگیں۔ ان کا آغاز 776 قبل از مسیح میں ہوا۔ ایک ہزار سال تک یہ بغیر کسی تعطل کے سن 393 تک جاری رہیں، جب رومن ایمپائر نے یونان فتح کر لیا اور اُدھر ایک کٹر عیسائی آ

گیا، جس نے یہ کھیلیں بند کر دیں۔ کوئی پندرہ سو سال تک پھر یہ کھیلیں نہ ہوئیں۔ تب سال 1896ء میں فرانس کے ایک استاد کی کوششوں سے یہ پھر شروع ہوئیں۔ ان میں پھر پہلی اور دوسری عالمی جنگوں کے علاوہ کسی وقت ناغہ نہ ہوا۔

ہے نا مزے کی بات، قلوپطرہ، یہ کھیلیں تمہارے دور میں بھی ہوتی تھیں۔ یاد ہیں؟

کھیلوں کے قانون قائدے وقت کے ساتھ بدلتے رہے۔ پہلے پہل صرف دوڑیں ہوتیں۔ پانچ سو میٹر کی دوڑ۔ پھر چھلانگیں، نیزا بازی اور گھوڑوں کی دوڑوں کے علاوہ رتھ کی دوڑ بھی رکھی گئی۔

رتھ دوڑ کے علاوہ، ہر قسم کا مقابلہ، کھلاڑی الف ننگے ہو کے کرتے۔

ننگے بدن دوڑتے۔

ننگے پونا چکر گھوم کے ہاتھ میں پکڑی ڈسک پھینکتے۔ ننگے کھلاڑی ہی چھلانگیں لگاتے۔ آج کل دور سے دوڑ کے آ کے، چھلانگ مارتے، اُس زمانے میں وہیں کھڑے کھڑے چھلانگ مارنی پڑتی تھی۔

مزے کی بات، شائقین کے لیے بھی اسی طرح کے قوانین تھے۔ کھلاڑیوں کے لیے تو لازم تھا کہ وہ نسلی طور پر خالص یونانی ہوں، کوئی کسی اور نسل کا بندہ حصہ نہیں لے سکتا تھا۔ غلام کھلاڑیوں کو حصہ لینے کی مناعی تھی۔ مگر دیکھنے والا ہجوم ہر طرح کے لوگوں سے بھرا ہوتا۔ اُس میں یونانی، غیر یونانی اور غلام بھی دیکھنے کو جمع ہو سکتے۔

کھلاڑی سبھی مرد ہوتے۔

مگر دیکھنے کے لیے لڑکیاں اور غیر شادی شدہ عورتیں آ سکتی تھیں۔

شکر کرو قلوپطرہ،

تم وہ کھیلیں دیکھنے نہیں گئی کبھی۔ حکم تمہارے لیے بھی وہی ہونا تھا۔ مگر تم تو حکم دینے والی ملکہ تھی۔ میں تو ان بیچاری تماش بین لڑکیوں کی بات کر رہا ہوں۔ ان کے لیے حکم یہی تھا، کہ دیکھنے والے ہجوم میں مرد و زن سب ننگے ہوں۔ سوائے اُن سیانی عمر کے سفیروں اور مبصروں کے۔

ہر چار سال بعد، اُدھر میلہ لگ جاتا۔ لوگ ٹولیوں میں گاتے بجاتے، کھاتے پیتے، ناچتے مستیاں کرتے آتے۔ کوئی پیدل ٹولی آ رہی ہوتی، ساتھ اپنے گویے اور گانے بجانے، ناچنے والی رقاصاؤں کے ساتھ، کوئی رتھوں، گدوں اور گھوڑوں کے پیچھے بندھے ٹانگوں میں لپکتے شور مچاتے آتے۔ ساحل پہ اپنی کشتیاں کھڑی کر کے، لوگ کرائے کی سواری لیتے یا پیدل میدان میں پہنچ جاتے۔

کھیل کے میدان کے ہر طرف، کھانے پینے کی دوکانیں سج جاتیں۔ ناچنے گانے

کے اڈے بن جاتے۔ شروع شروع میں تو ایسے شور شرابے تمبو قناتوں میں ہوتے۔ ہولے ہولے میزبان ریاست نے ہر طرف دیدہ زیب چوبی ستون کے علاوہ پتھر کے ستون کھڑے کر لیے، اوپر دیودار کے تنوں کو کاٹ کے تکونی چھتیں بنالیں۔ لوگوں کے ٹھہرنے اور کھانے پینے، ناچ گانے اور ہر طرح کی مستی کے لیے مستی گھر بنا لیے۔

یونانی ریاستوں کے من چلے، چار سال کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ کھیلوں کے مہینے جولائی میں کسی قسم کی لڑائی کرنے والوں کے لیے کڑی سزا تھی۔ ایک بار 420 قبل از مسیح میں، ''سپارٹا'' والوں نے ''ٹرائے'' کا محاصرہ جاری رکھا۔ اُن کی پیشی ہوگئی۔ ججوں نے ''سپارٹا'' والوں کو دو لاکھ ڈرچاز کا جرمانہ کر دیا۔

ساری ریاستوں کے سفیر بن سنور کے، سروں پہ زیتون کی پتیوں کے تاج پہن کے آ جاتے۔ اُن کے ٹھہرنے کی مخصوص مزے کی جگہیں ہوتیں۔ رسم افتتاح کا جشن خاص طور پر شاندار ہوتا۔ کبوتر اڑائے جاتے، غبارے رنگا رنگ کے چھوڑے جاتے۔ ہر ریاست کا طائفہ میدان میں مٹک مٹک کے چلتا۔ جوان دوشیزائیں ننگ دھڑنگ پنڈال میں ڈانس کرتیں۔ شراب کے مٹکے الٹ جاتے۔ مداری کرتب دکھاتے پریڈ کرتے جاتے۔ پھلوں اور نت نئے کھانوں کی خوشبوؤں سے سارا ماحول مخمور ہو جاتا۔

آگے آگے سب کے، ''ڈیلفی'' کے مقدس عبادت گھر سے ایک مشعل روشن کی جاتی، جو دوڑتے کھلاڑی باری باری پکڑ کے میدان کا چکر لگاتے، اور پھر اُسے مرکزی جگہ پہ جما دیتے۔ وہ مشعل کھیلوں کے سارے دنوں میں جلتی رہتی۔

قلوپطرہ، تم اُس مشعل کو کیا جانو، جو صرف کھیل دنوں میں جلتی اور روشنی دیتی، تم تو صدیوں سے جلتی آ رہی ہو، روشنی پھیلاتی آ رہی ہو۔ تمہارے دم سے مصر کی زمین آج بھی دنیا بھر کے معاشروں میں ایک روشن قندیل ہے۔ وہ تو کھیل کود، دنوں کی مشعل ہوتی تھی۔

کھیلوں سے پہلے تمام کھلاڑیوں سے حلف لیا جاتا کہ کھیلوں میں وہ کوئی چالبازی یا ہیرا پھیری نہیں کریں گے۔ کھیلوں کے قوانین کا احترام کریں گے۔ ایمپائر کے فیصلے کو مانیں گے۔ ایمپائر سارے میزبان ملک کے ہوتے۔ وہ کھیلوں سے دس مہینے پہلے، کھلاڑیوں کو جمع کرا کے، انہی کے سپروائزر سے ان کی تربیت کرواتے۔ اُن کے جسموں پہ خاص تیل ملا جاتا۔ انہیں گھی اور پنیر کھلایا جاتا۔

گھی اور پنیر تو تم بھی کھانے کی شوقین تھی،

قلوپطرہ۔ ہے نا؟

کھیلیں شروع ہوتے ہی میدان میں شور شرابا بڑھ جاتا۔ اپنے اپنے دیس، اپنے شہر، اپنی بستی کے کھلاڑیوں کی حوصلہ افزائی کے لیے پنڈال کے کناروں پہ موجود ہجوم میں ننگی کنواری لڑکیاں، ننگے نوجوان، اور کپڑوں میں ملفوف مبصر اور سفیر کھڑے ہوتے۔

ایک بار گھپلا ہو گیا۔

شادی شدہ عورتوں کا تماش بینی کے لیے داخلہ ممنوع تھا۔ مگر ایک عورت جس کا خاوند دوڑ جیت چکا تھا اور اس بار اس کا بیٹا دوڑنے آیا تھا۔ وہ عورت جس کا نام "کیلیٹریا" تھا، وہ مردانہ کپڑے پہن کے مبصروں میں آ بیٹھی۔ مقابلہ شروع ہوا۔ کھلاڑی دوڑنے لگے۔ اُس کا بیٹا سب کھلاڑیوں کو پچھاڑتا میدان مار گیا۔ ایک نہیں مختلف نوعیت کے اُس نے پانچ میچ جیتے۔

پانچواں مقابلہ دوڑ کا تھا، جونہی اُس نے دوڑ جیتی، اُس کے شہر سے آئے لوگوں نے چھلانگیں لگانا شروع کر دیں۔ خوشی سے وہ دیوانے ہو گئے۔ اُس کی ماں جو مبصر بنی کپڑے پہن کے کھیل دیکھ رہی تھی، بیٹے کی فتح دیکھ کے آپے سے باہر ہو گئی اور اپنے کپڑے اتار کے ہاتھوں سے انہیں لہرانے لگی۔

اولمپیا کی جیوری جمع ہو گئی۔

ایسی بے احتیاطی پہ بڑی سخت سزا تجویز ہوئی ہوئی تھی۔ مگر اُس عورت کا معاملہ غیر معمولی تھا۔ اُس کے ساتھ طاقت، انہی کھیلوں کے دو چیمپئن کی تھی۔ اُسے سزا کیسے ملتی۔ آئندہ کے لئے قانون میں ترمیم ہو گئی کہ مبصر بھی تمام ننگے ہوں گے۔

رتھوں کے کھلاڑی کپڑے پہن کے رتھ دوڑاتے۔ رتھوں کی دوڑ میں کئی موڑ آتے۔ ایک مرکزی پنڈال کے سامنے کا موڑ سب سے خطرناک تھا۔ اکثر رتھ اُدھر لڑھک جاتے۔

کشتیوں کے مقابلے بڑے خون ریز ہوتے۔ پہلوانوں کو صرف تین حرکتوں کی مناعی تھی۔ اُس سے انہیں منع کیا ہوا تھا۔ ایک تو کوئی کسی کھلاڑی کی آنکھوں میں انگلیاں یا چوٹ نہ لگائے گا۔ دوسرے دانت سے کاٹنے کی اجازت نہ تھی۔ مدِ مقابل کو جان سے مارنا منع تھا۔ اگر کوئی جان سے مر جاتا تو، فتح کی ٹرافی مرحوم پہلوان کو ملتی۔

اٹلی کا "مائو" پہلوان مسلسل پانچ بار، یعنی بیس سال تک جیتتا رہا۔ وہ میدان میں آ کے، اپنا خونخوار وحشی چہرہ لوگوں کی طرف کرتا، اپنے ماتھے پہ سنہری ڈوری باندھتا، پھر کنپٹی کی وریدیں ایسے پھلاتا کہ ٹھک سے باندھی ڈوری ٹوٹ جاتی۔ لوگ تالیاں مارتے شور مچاتے اچھلنے لگتے۔

ترکی کے جنوبی ساحلی علاقے ''جینین'' کا ''پولائیٹس'' ایک دن میں تینوں مقابلے جیت گیا۔ اُس کے لوگ اچھل اچھل کے پاگل ہو گئے۔

''پولائیٹس'' تین مقابلے جیت کے بھی جھکا جھکا ملے۔

دیکھ ۔ لفظ ''پولائٹ'' ہی دنیا کو دے گیا۔ جہاں کا وہ تھا، وہ ترکی کا اصل علاقہ، جینین۔

یہ دوسرا لفظ ملا۔

''لیونیڈاس آف رہوڈوز'' مسلسل چار بار 164 سے 184 قبل از مسیح جیتتا رہا۔ چوتھے مقابلے بعد دوڑتا دوڑتا رکا نہیں، دوڑے گیا۔ گھر اُس کا 128 کلومیٹر دور تھا۔ گھر جا کے سانس لیا۔

گھوڑ سواری کے مقابلے میں، طے یہ تھا کہ جو گھوڑا دوڑ میں سب سے آگے رہا، وہی فاتح۔ ایک منہ زور گھوڑے نے دوڑ میں سوار کو گرا دیا، مگر میدان میں دوڑتا گیا۔ سب کو پچھاڑ کے پہلے نمبر پر آ گیا۔ سوار کہیں پیچھے گرا پڑا اپنی کمر پکڑے بیٹھا تھا۔ جیتنے کا انعام اُسی خالی بھاگے آئے گھوڑے کو ملا۔ لوگوں نے اپنے شہر جا کے، سوار کے بجائے صرف اُس گھوڑے کا مجسمہ بنا کے سجا لیا۔

ایک باکسر نے گھونسا مار کے مخالف کو مار دیا۔ انعام مرنے والے کو مل گیا۔ وہ گونسا مارنے والا باکسر غصے میں تلملاتا اپنے شہر گیا۔ راہ میں اک سکول تھا۔ سکول کے ستون کو دھکا مار کے گرا دیا۔ اوپر سے چھت گر گئی۔ نیچے 60 بچے تھے، اکثر اُن میں سے مر گئے۔ لوگوں نے باکسر کو پکڑ کے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ جج کٹہرے میں کھڑے غصے سے ناک پھولائے باکسر کو دیکھ دیکھ فیصلہ سنانے سے ڈرے۔

''تھیوجینن'' پانچ صدی قبل مسیح، 20 سال کشتیوں میں مسلسل پانچ بار جیتا۔ چھٹی بار بوڑھا ہو چکا تھا، پھر بھی کشتی لڑنے پہنچ گیا۔ لوگوں نے شور مچا کے اُسے عزت و احترام سے اپنے کندھوں پہ بٹھا لیا۔ اُس کے مخالف نے بھی اُسے عزت دی۔ لوگوں نے واپسی پہ اُس کے شہر میں اُس کا مجسمہ بنا کے سجا لیا۔

''انتھوزیم'' لفظ اِس نے اپنے برتاؤ سے دیا۔

سب سے بڑا مجسمہ ''فیڈیاس'' سنگتراش نے سونے اور ہاتھی دانت جمع کر کے پندرہ میٹر اونچا ''زیوس'' دیوتا کا بنایا اور اُسے گارڈز ٹمپل میں سجا دیا۔ اُسے سات بڑے ونڈرز میں شمار کیا گیا۔

قلوپطرہ، مجسمے تو تمہارے بھی بہت بنے۔ مصر کے علاوہ یونان اور روم میں بھی۔

یاد آیا؟

گھڑ دوڑ تو تم بھی کرایا کرتی تھی۔ بھول گئی؟ گھوڑوں کی دوڑ اُدھر رتھوں میں باندھ کے بڑی

خوفناک ہوتی - بارہ چکر میدان کے لگانے پڑتے - پہلے ہر رتھ کے آگے چار گھوڑے ہوتے، پھر وہ دو ہو گئے- حادثے عام ہوتے- موڑ پہ رتھ اکثر الٹ جاتے- گھوڑے گرے ہوئے رتھ اور گھوڑوں میں پھنسے بندے کے جسم بھاگتے بھاگتے توڑ دیتے-

دوڑیں، نیزا بازی، چھلانگیں، ڈسکس تھرو ساتھ پنڈال میں خوانچے والے، شراب کے مٹکے- وہیں پنڈال میں کھیلوں کے وقفوں میں رنگ و سرور کی محفلوں میں اُس عہد کے بڑے بڑے شاعر اور فلاسفر آ آ اپنی باتیں سناتے- انہی شور شرابے میں اُس عہد کا سب سے بڑا افلاسفر "پلاٹو" بھی اُدھر لوگوں کا مجمع لگا کے اپنی کتاب "ریاست" کے مضامین سناتا- شاعر جیتنے والوں کی مدح میں نظمیں کہتے-

وہاں صرف جیتنے کا ایک ہی انعام ہوتا-

پہلا انعام-

دوسرا اور تیسرا انعام اُن دنوں نہیں ہوتا تھا- نہ کوئی سلور میڈل نہ برونز- گولڈ میڈل والوں کو بھی گولڈ میڈل نہ ملتا- صرف اُن کے سر پہ صنوبر کے پتوں کا تاج پہنا دیا جاتا- کوئی دوسری گیم میں بھی اوّل آتا تو اُس کے سر پہ "اجوائن کی کونپلوں" سے بنا سمنگ گیمز تاج پہنا دیا جاتا- شروع شروع میں وہاں "میراتھن" دوڑ نہیں ہوتی تھی- 490 قبل از مسیح میں، یونان نے ایران کو میراتھن کے میدان میں شکست دے دی - "فیڈیپائڈز" یونانی خوشی میں پاگل ہو گیا- 35 کلومیٹر دور اپنے شہر "ایتھنز" طرف بھاگتا گیا- اُدھر جا کے، اپنے شہر کے حیران سوالیہ چہروں کو دیکھ کے صرف ایک لفظ بولا،

"یونان جیت گیا"

اور مر گیا-

اُس کی یاد میں پھر "میراتھن" دوڑ شروع کی گئی- ہزار سال تک لڑتی مرتی ریاستوں کے لوگ، چار سال بعد، جولائی میں امن اوڑھے یوں کھیل کود میں اپنی اپنی قوم اور اپنی ریاست کی برتری کھیلوں کے ذریعے پرامن طریقے سے منواتے رہے-

پھر اٹلی میں عیسائی پادری بادشاہ "تھیوڈوس" آ گیا- رومن ایمپائر کا وہ حکمران تھا- تھا مذہبی تنگ نظر- اپنے زمانے کا سمجھو، وہ "طالبان" تھا- اُس نے اولمپکس کھیلوں کو لامذہب قرار دے کر بند کرا دیا- اُس کا پوتا "تھیوڈوس دوم" اُس سے بھی بڑا ٹیرارسٹ نکلا، اُس نے کھیلوں کی وہ جگہ، اردگرد بنے پنڈال کی عمارتیں، مہمانوں کے پر تعیش کمرے، کھیلوں کے میدان سارے توڑ دیے-

چھٹی صدی اُدھر زلزلہ آیا- سب کچھ الٹ پلٹ ہو گیا-

اوپر سے اگلے سال سیلاب آ گیا-

ہزاروں سال گزر گئے۔ کھیلوں کے میدان اور میدان کنارے کے سارے پنڈال ہزاروں من مٹی کے نیچے دب گئے۔ کتابوں میں ہزار سال کی ساری داستان کا ذکر رہا۔ نشان سارے مٹ گئے۔ لوگ بھول گئے وہ ساری جگہیں۔

2275 سال گزر گئے۔

1875 میں اُدھر کھدائی شروع ہوئی۔ کچھ ہی عرصے میں پرانے اولمپیا کی بنیادیں، دیواریں اور میدان سارے زمین کے لحاف کے نیچے سے نکال لیے۔

1894ء میں اولمپک کھیلیں پھر شروع ہو گئیں۔

شروع شروع میں ہم ایک کھیل ہاکی کا گولڈ میڈل لاتے رہے، پھر وہ سلور میڈل سے ہوتا برونز میڈل میں بدل گیا۔ اب دور دور تک ان اولمپک کھیلوں میں ہمارا کوئی کھلاڑی کوئی قابل ذکر انعام لے کر نہیں آتا۔ ہاکی ہم نے تباہ کر لی۔

باقی بے شمار کھیلیں ہیں، جہاں ہمارے لوگ اگر سائنسی بنیادوں پہ تیار کیے جائیں، ہمارے شہروں میں ان کھیلوں کے لیے سٹیڈیم اور ٹرینرز ہوں، کھلاڑیوں کے لیے کوئی ''انسٹی ٹیوٹ'' ہو۔ انہیں کوئی نوکری ملے۔ اُن کے مستقبل کی کوئی ضمانت لے تو وہ بھی دنیا کی دوسری قوموں کی طرح ہمارا جھنڈا قوموں کے پنڈال میں اونچا کر سکتے ہیں۔

ہمارے ملک کی سب کھیلوں اور اتھلیٹکس کو صرف ایک جوئے سے بھری کھیل کھا گئی، یہ کھیل ہے کرکٹ۔ جو اولمپک کھیلوں میں ہے بھی نہیں۔ دنیا میں قسم قسم کے اتھلیٹکس کی عزت ہے۔ اگر پوری دنیا میں کسی کھیل کا عالمی جنون ہے تو وہ فٹ بال ہے۔ حیرت ہے، سب سے سستی اسی کھیل کو کس سازش کے تحت ملک میں پلنے نہیں دیا گیا۔ ہمارے ''لیاری'' کے کھلاڑی اس قابل ہیں کہ وہ پورے ملک کے لیے یہ عزت جیت سکیں۔

ہمارا قومی کھیل ''ہاکی'' بھی، کرکٹ پہ قربان کر دیا گیا ہے۔ ''کرکٹ'' عالمی کھیل ہے بھی نہیں۔ یہ برطانیہ کے زیر تسلط، غلام بنی رہی قوموں کا کھیل ہے۔ جن جن ملکوں کو کبھی برطانیہ نے تاراج کیے رکھا، جہاں جہاں لوگ برطانوی سامراج کے غلام بنے رہے، جنہیں اب ''کامن ویلتھ'' کہتے ہیں، یہ صرف اُن ملکوں کا کھیل ہے۔ جہاں غلامی کے دنوں میں گورے ہیٹ پکڑے شارٹ لگاتے اور ہمارے کالے لوگ بھاگ بھاگ کے گیند پکڑ کے گورے باؤلر کو پکڑاتے۔ غلامی کی اس یادگار کو قائم کیے رکھنے کا صرف یہ مطلب ہے کہ ابھی بھی ہم

نے غلامی کا طوق نہیں اتارا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ملک میں اوٹ پٹانگ وزارتوں کے ہجوم میں ایک پوری "سپورٹس منسٹری" ہو، جو صرف میرٹ پہ کام کرے۔ پہلا کام یہ کرے کہ کرکٹ سے جان چھڑائے، جس کھیل اور اس کے کھلاڑیوں نے ملک کا حلیہ خراب کیا ہوا۔

ایک "کرکٹ بورڈ" کے "اثاثے" نام بدل کے "اولمپک سپورٹس" بنا کے دنیا کی ساری کھیلیں اور اتھلیٹکس کو فروغ دیا جا سکتا۔ زیادہ سے زیادہ کھلاڑی اولمپک کھیلوں کے لیے تیار ہونے چاہیے۔ یوں دنیا میں کوئی جانے گا کہ ہے کوئی ملک پاکستان۔ کھیلیں ضروری ہیں۔

یہی جذبہ جیت کے ساتھ ساتھ ہارنا بھی سکھاتا۔ جسے "سپورٹس مین سپرٹ" کہتے۔ ہم نے اس سے الٹ سبق لیا ہوا۔ "انا" کے دائروں کو دبوچنے کے لیے ہر طرح کی شدت پسندی کا توڑ کھیلوں میں ہے۔ جوانوں کے اندر جوانی میں، جوان رکھنے والے ہارمونز اُن سے سب گھناؤنے کام کراتے۔ بہت کم ایسے جوان ہوتے جو شروع دنوں، کالج اور یونیورسٹی میں سائنس یا آرٹس کی اعلیٰ منزلوں پہ چڑھ جاتے۔ قوموں کی ہمیشہ رہنے والی عزت اور توقیر تو اُن سے ہوتی۔ کھیل کود میں وقتی جذبات کو ایک رستہ مل جاتا۔ دائمی اور قوموں کا نصیب جگانے والے کھیل کود کے میدانوں کے وقتی ہیرو ہوتے، جو تماش بین، تالیاں بجانے والی احمق مخلوق کے لیے بے ضرر "ٹائم پاس" ہوتے۔ قوموں کی عزت اور وقار بڑھانے والے وہ ہوتے جو کھیل کود کی بجائے سائنس یا آرٹ کی دنیا میں اعلیٰ کارکردگی دکھا کے قوم و ملک کی تقدیر میں تقدس قائم کرتے۔ اصل "ہیرو" یہ ہوتے۔ یہ سو میں پانچ ہوتے۔ انہیں ان کھیلوں کی ضرورت نہیں۔

ضرورت اُن باقی پچانوے فی صد نوجوانوں کو ہے، جن کے پاس جوانی تو ہے، مگر سامنے کوئی منزل نہیں۔ کوئی رستہ نہیں۔ یوں امن کے رستوں میں، کھیل ایک صحت مند رستہ ہے۔

لازم یہ ہے کہ اولمپک گیمز کو سامنے رکھ کے، ہر ایونٹ کے لیے لڑکے اور لڑکیاں تیار کی جائیں۔

کوئی کھلاڑی جب دنیا کے چنڈال میں ہمارا قومی پرچم اوپر کر کے، ساری دنیا کو ہمارا پیارا قومی ترانہ سنوائے تو یہ سارے ملک کے لیے عزت اور سکون کی بات ہے۔

شاید کوئی اس رستہ کو سوچے۔

کیا خیال ہے تمہارا قلوپطرہ۔

☆☆☆☆☆

کرول گھاٹی کے صحافتی کردار

''مکلی میں مرگ'' کی اشاعت کے بعد غافر شہزاد کا نیا ناول اتنی جلدی شایع ہو جانا کوئی ایسی انہونی بات تو نہیں ہے مگر پھر بھی یہ بات ذہن میں ضرور آتی ہے کہ ہر سال نئے ناول کی اشاعت کے اس سلسلے کو وہ کیسے برقرار رکھتے ہیں۔ انہوں نے 1997 میں ''لوک شاہی'' ناولٹ تحریر کیا تھا اور اس وقت بھی ان کا خیال تھا کہ وہ اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے ''افسر شاہی'' اور دوسرے ناول لکھیں گے مگر بوجوہ یہ سلسلہ وہیں رک گیا اور اب چوبیس پچیس سالوں کے بعد اوپر تلے ان کے ناولوں کی اشاعت اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ اتنا عرصہ اگرچہ انہوں نے ناول تحریر تو نہیں کیا مگر ان ناولوں کی کہانیاں ان کے اندر پلتی بڑھتی رہی ہیں اور اب وہ صرف ان کو صفحہ قرطاس پر لا رہے ہیں۔ ''مکلی میں مرگ'' کی اشاعت 2020 میں اور ''کرول گھاٹی'' کی اشاعت 2021 میں ہونے کے بعد اب وہ اپنے نئے ناول ''استغاثہ'' پر کام کر رہے ہیں، جس کی اشاعت 2022 میں متوقع ہے۔

غافر شہزاد کے اب تک کے اگر تینوں ناولوں کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ایک اشتراک ابھرتا ہے کہ ان کے تینوں ناولوں میں صحافی

شاہدہ دلاور شاہ

کا کردار موجود ہے۔ ''لوک شاہی'' تو ہے ہی ایک کرداری ناول جو ایک صحافی کے کردار کی پیش کش کے طور پر اپنی کہانی کو آگے بڑھاتا ہے۔ یونیورسٹی کے زمانے سے لے کر صحافت کے بام عروج تک پہنچنے والی ایک صحافی کی کہانی اس ناول میں پڑھنے کو ملتی ہے جسے اس کا پروفیسر اپنے مخصوص نظریات میں ڈھالنے کے بعد مارکیٹ میں اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے لاتا ہے۔ مارکیٹ میں متعارف ہونے کے بعد یہ کردار مقتدر قوتوں کی بچھائی ہوئی بساط پر کھیلتا ہے، بل کہ مقتدر قوتیں اپنی مرضی کا کردار اسے تفویض کرنے کی کوشش کرتی ہیں مگر جب وہ اس کے لیے تیار نہیں ہوتا تو اسے بظاہر نظر بند کر دیا جاتا ہے اور اس کے نام سے بے ضرر اور غیر متعلق موضوعات پر کالم ایجنسیاں شایع کرانے لگتی ہیں اور یوں اس کردار کو ذہنی اور عملی طور پر مفلوج کر دیا جاتا ہے۔

''دمکلی میں مرگ'' کا صحافی کردار دو آتشہ ہے۔ ایک جانب وہ صحافت کے پیشے سے وابستہ ہے تو دوسری جانب اس کی تعلیم و تربیت آرکیٹیکچر کے شعبے میں ہوئی ہے۔ یہاں وہ صرف صحافی نہیں ہے کہ جو عام سطح کی سیاسی اور سماجی خبروں کو اور ان سے جڑی کہانیوں کو شایع کر کے اپنی منصبی ذمہ داریاں پوری کرتا ہے بل کہ وہ شعبہ فن تعمیر کے منظر نامے پر جنم لینے والی کہانیوں اور کرداروں کو ''دمکلی میں مرگ'' میں نہایت صراحت سے پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے شعبے میں تاریخی عمارات سے نہ صرف دلچسپی رکھتا ہے بل کہ اس کی معلومات اور عمارتوں کے حوالے سے تاریخی شعور اس ناول کی کہانی کو تشکیل دینے میں معاونت کرتے ہیں۔ یہ ایک مشکل اور مختلف تیکنیک تھی جو غافر شہزاد نے اپنے اس ناول میں اختیار کی۔ یہ ناول نویسی کے عمومی اسلوب سے بالکل الگ ناول ہے۔ بظاہر دو تین کہانیاں اور کردار الگ الگ اپنے دائرے کے اندر حرکت کرتے ہیں اور حتمی طور پر یہ کہیں آپس میں اس طرح ملتے بھی نہیں جس طرح روایتی انداز سے ایک ناول کی کہانی کے کردار مل جاتے ہیں اور مرکزی کردار کا حصہ بنتے ہیں مگر اس ناول میں ایسی صورت حال نہیں ہے۔ ان کرداروں کا زمان و مکان ایک ہی ہے، منظر نامہ اور لینڈ اسکیپ ایک ہی ہے جس میں یہ کردار الگ الگ چلتے ہیں مگر ایک بڑے کینوس پر پیش کیے جانے والے منظر نامہ کا حصہ بنتے دکھائی دیتے ہیں۔ اس ناول میں غافر شہزاد صحافتی کردار کے ذریعے ہی سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر ہونے والی کرپشن، لوٹ

کھسوٹ اور بے ایمانیوں کو سامنے لاتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایک مقام پر یوں لگتا ہے جیسے ان کے ناول کا مرکزی بیانیہ یہی ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس ناول کا مرکزی بیانیہ دراصل ایک مزار کی شناخت کو تبدیل کیے جانے کی کوششوں کو آشکار کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ تعمیراتی روایت اور طرزِ تعمیر کے درمیان چلنے والے روایتی اور جدید فنِ تعمیر کے مباحث بھی ملتے ہیں جو پڑھنے والے کے ذہن اور تخیل کو ایک الگ دنیا میں لے جاتے ہیں جس تک عام آدمی یا قاری کی رسائی نہیں ہوتی۔

اپنے اسلوب کے اسی تکنیک کو اگلے ناول ''کرول گھاٹی'' میں بھی غافر شہزاد نے استعمال کیا ہے۔ مگر یہاں کرداروں کی بھرمار نہیں ہے۔ یہاں کرداروں کی جگہ پر مختلف ادارے اپنا کردار ادا کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ موٹر وے رنگ روڈ پر ہونے والے ایک ریپ کیس کی تشہیر سوشل اور الیکٹرونک میڈیا میں ہوتی ہے، بنیادی کہانی کی حد تک بات یہیں تک محدود ہے مگر غافر شہزاد کے تخیل نے رات کو ہونے والے اس عمومی سے واقع کو اس انداز سے بیان کیا ہے کہ قاری حیرت زدہ ہو جاتا ہے کہ جب کوئی وقوعہ ہوتا ہے تو اس میں لوگوں اور اداروں کا کیا کیا کردار سامنے آتا ہے۔

یہاں بھی سوشل، الیکٹرونک اور پرنٹ میڈیا سے وابستہ صحافیوں کی ایک بڑے کینوس پر پیش کش ناول کے اسلوب کو روایتی انداز سے آگے بڑھا کر آج کی پیچیدہ شہری زندگی کو ناول کے متن کا حصہ بناتی ہے۔ صحافت کی جدید شکل ہمیں اس ناول میں دکھائی دیتی ہے۔ ناول نگار کئی جگہوں پر اس بات پر اصرار کرتا دکھائی دیتا ہے کہ صحافت کا کام کبھی سچائی کو سامنے لانا ہوتا تھا مگر اب یہ صحافت ایک ہتھیار کے طور پر استعمال ہوتی ہے جس میں وقوعے کو اپنی مرضی اور منشا کے مطابق، ایک الگ سیاق وسباق میں، مدلل انداز سے پیش کیا جاتا ہے۔ ایک جگہ پر تو ناول نگار اس بات پر زور دیتا ہے کہ آج سچ اور جھوٹ کوئی دو الگ چیزیں نہیں ہیں، بل کہ ایک وقت میں بولا جانے والا جھوٹ بھی اس لمحے کا ایک سچ ہی ہوتا ہے، جو اگر چہ جھوٹ کی طرح بولا جا رہا ہوتا ہے۔

ناول نگار نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے ''خبر ساز''، ''واقعہ ساز'' اور ''کیمرا کباڑ'' کے کردار ایک تجریدی سطح پر متشکل کیے ہیں۔ جو ہوتا ہے، صحافی کا کام صرف اس کی پیش کش کی حد تک محدود نہیں رہا بل کہ اب جیسے اوپر سے اشارہ ملتا ہے، خبر ساز، اس تناظر میں خبر پیش کرتا ہے۔ یہ بدلتی ہوئی صحافت کا منظر نامہ ہے جس کی حقیقی سطح پر ناول نگار نے اس

طرح عکاسی کی ہے کہ اس موضوع کی پیچیدگیاں بھی سامنے آ گئی ہیں۔ کیمرہ کباڑ کا نام بظاہر عجیب سا لگتا ہے، جب اس کردار کے بارے میں غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کیمرہ مین جو کچھ شوٹ کرتا ہے، وہ ایک کباڑ کی صورت ہی ہوتی ہے جب تک کہ اس کو ایک خاص زاویہ نگاہ سے پیش نہ کر دیا جائے اور حقیقت میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ تو نیوز سٹوڈیو پہنچ کر ہی فیصلہ ہوتا ہے کہ بنائی جانے والی خبر کے تناظر میں کون کون سی وڈیو کلپ شامل کی جا سکتی ہیں۔

ناول میں الیکٹرونک میڈیا کی سہولت کو درست انداز سے پیش کرتے ہوئے ''منٹو کے مطابق'' نام کے کچھ پروگرام ڈائیلاگ کی صورت میں شامل کیے گئے ہیں۔ جب بھی کوئی وقوعہ ہوتا ہے، اس کے حوالے سے ماہرین کی رائے لی جاتی ہے اور اس وقوعے کے بارے میں بہت سی باتیں، ممکنہ زاویوں سے زیر بحث لائی جاتی ہیں۔ ''منٹو کے مطابق'' کا بنیادی تھیم یہی ہے مگر یہاں ستر سال پہلے مر جانے والے معروف افسانہ نگار ''سعادت حسن منٹو'' کو ایک اینکر پرسن اس موضوع پر گفتگو کرنے والے ماہر کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ ہفتہ وار پروگرام میں، ناول میں وقفے وقفے سے ابواب کی شکل میں، جوں جوں تفتیش آگے بڑھتی ہے، اس پر تبصرے کیے جاتے ہیں۔ ان تبصروں میں سعادت حسن منٹو اپنے کرداروں اور افسانوں کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے تنقیدی نقطہ نگاہ سے وقوعے کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لاتا ہے۔ ناول کا یہ حصہ اپنے اندر بہت کچھ سمیٹے ہوئے ہے۔ یہ بہت بزارسک تھا جسے ناول نگار نے چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور سچ بات تو یہ ہے کہ اسے خوب نبھایا۔ گویا جو باتیں متن کا ویسے حصہ نہیں بن سکتی تھیں، وہ اس پروگرام میں منٹو اور اینکر پرسن کے منہ سے کہلوائی گئی ہیں۔ یہ تیکنیک اس سے پہلے اردو ناول میں استعمال نہیں ہوئی۔ بیانیے اور کرداروں کے ساتھ ساتھ ڈرامے کی یہ تیکنیک ناول کو بہت مختلف اور منفرد بنا دیتی ہے۔ اس تیکنیک نے ناول کی مجموعی صورت حال کو سنبھالا اور واقعات میں ایک باہمی تعلق پیدا کرتے ہوئے متن کو اکائی کی صورت عطا کر دی ہے۔

غافر شہزاد کے تینوں ناول پڑھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس نے ایک صحافی کے کردار کو ہی کیوں تسلسل کے ساتھ اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے؟ اردو ناول میں صحافی کو یوں مرکزی کردار شاید ہی کہیں دیا گیا ہو۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ غافر شہزاد خود بھی کالم نگار ہیں، سیاسی، سماجی

اور معاشرتی صورت حال کی پیش کش اور اس کا تجزیہ ان کے اہم موضوعات رہے ہیں۔ وہ شہری زندگی کی پیچیدگیوں کو اسی تناظر میں اپنے کالموں میں پیش کرتے رہے ہیں۔ ایک جانب تعمیرات اور اس کا فن ہے، جسے غافر شہزاد نے تاریخ کے سیاق وسباق کے ساتھ اپنی تحریروں میں ہمیشہ پیش کیا ہے، دوسری جانب شہری زندگی اور اس کی پیچیدگیاں ہیں، جن کی پیش کش میں صحافی کو ایک واچ ڈاگ کے طور پر اپنی ذمہ داریاں نبھانا چاہیے تھیں۔ ہوا یوں کہ صحافی نے اپنے لیے ایک نیا کردار ڈھونڈھ لیا ہے - وہ اپنی پیشہ ورانہ ذمہ داریوں کو ایک جانب رکھتے ہوئے اقتدار اور دولت کے کھیل کا حصہ بن گیا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت حال میں صحافی یا اینکر پرسن ایک مداری کے کردار میں ڈھل گیا ہے جو ایک جانب تماشائیوں کا دل لبھاتا ہے اور دوسری جانب ان کی جیبوں سے پیسے نکلواتا ہے۔ اس وقت جب کہ الیکٹرونک میڈیا کے پرائم ٹائم میں ایسے پروگرام اور ایسے صحافی ہی لیڈ کر رہے ہیں اور سچائی کی پیش کش میں ایک مشاق کھلاڑی کی طرح اپنا کردار نبھا رہے ہیں۔ ''مکلی میں مرگ'' کا صحافی کردار اپنے پیشے سے کمٹمنٹ نبھاتا ہے اور کہیں بھی سمجھوتہ نہیں کرتا یہاں تک کہ بابا مستان کے کردار کی سٹوری کی تلاش بھی کرتا ہے - ''کرول گھاٹی'' کا اینکر پرسن سعادت حسن منٹو کی بے خوف زبان کے سامنے اکثر زچ ہوتا ہے مگر پروگرام کی ریٹنگ بڑھانے کے لیے اسے منٹو کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ناول کے آغاز اور اختتام پر مورخ کو بھی سچائی کی تلاش کا نمائندہ بنا کر ناول کے موضوع کی مناسبت سے شامل کیا گیا ہے۔ ناول کا اختتام ان الفاظ پہ ہوتا ہے: ''مورخ قلم توڑ کر بیٹھا ہے۔ اس کے سامنے سارے شواہد بکھرے پڑے ہیں مگر اسے یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ کون سی سچائی حتمی ہے، جسے سامنے لانے کی ذمہ داری اس کے کاندھوں پر ہے''۔ جب کہ ناول کا آغاز ان الفاظ میں ہوتا ہے: ''تاریخ سچائی کے لیے ہمیشہ شہادت مانگتی ہے۔ تاریخ کی یہ شہادت واقعات پر مبنی ہوتی ہے جنہیں کوئی نہ کوئی فرد اپنے عہد میں احاطہ تحریر میں لاتا ہے''۔ یہاں ''شہادت'' کا لفظ ہر دو حوالوں سے معنی خیز ہے۔ اکیسویں صدی کا المیہ یہ ہے کہ وہ صحافی جنہوں نے سچ آشکار کرنے کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر لی تھی، وہ سرمایہ داری نظام اور مقتدر قوتوں کا حصہ بن کر دولت اور امارت کی دوڑ میں شامل ہو گئے ہیں۔

☆☆☆☆☆

''املاک''، سحر تاب رومانی کا ساتواں شعری مجموعہ

اُردو غزل 1960 سے جدید دور میں سفر کر رہی ہے بلکہ یوں کہہ لیجئے کہ اُردو غزل اب مابعد جدیدیت کے دور میں داخل ہو چکی ہے، لیکن فکر انگیز بات یہ ہے کہ جدید اور مابعد جدید میں خط فاصل ابھی تک نہیں کھینچا جاسکا۔ اُردو غزل کی یہ خصوصیت بڑی دل کش ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول اور موضوعات کو سمو کر ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ ہم اسے اُردو غزل کی ایک بہت بڑی صلاحیت سمجھتے ہیں۔ معاشرے کی بدلتی ہوئی قدریں ہوں کہ سماجی ناہمواری یا اس کے نتیجے میں سامنے آنے والے حالات وواقعات غزل سب کو اپنے دامن پر سجا لیتی ہے۔ عصر رواں میں چند گنے چنے شعرا جدیدیت، مابعد جدیدیت دور موضوعات غزل پر احسن انداز میں کام کر رہے ہیں۔ سحر تاب رومانی اُن میں سے ایک، ہنر مند شاعر ہیں وہ اپنی انفرادیت سے اُردو شاعری میں ایک اسلوب اختیار کرنے میں کوشاں ہیں۔ نت نئے قوافی اور بھولے بسرے قوافی جو عمومی طور پر شعراء فراموش کر چکے ہیں کو زندہ کرنے کے ساتھ ایک خاص انداز کے ساتھ مضامین غزل میں وسعت کے کوشاں ہیں۔ ان کا یہ انداز اُردو شاعری میں ایک بہار کا جھونکا اور اُردو زبان و بیان کی ترقی میں معاون ثابت ہو رہا ہے۔ اس وقت ہزاروں شعری مجموعے اشاعت پذیر ہو رہے ہیں جو علم وفنون کے حوالے جمود کا شکار نظر آتے ہیں۔ مگر سحر تاب رومانی کا کمال ہے کہ وہ اُن فراموش کردہ حروف کو بغیر کسی مترادفات کے اُن کے اصلی وضع

رانا خالد محمود قیصر

میں استعمال کر کے غزل میں ایک حسن پیدا کر دیتے ہیں۔ سحرتاب رومانی کے شعری مجموعوں میں گفتگو ہونے کے بعد (2010) ممکن (2013)، زندگی کے چاک پر (2016)، دھوپ کے پار (2018)، شیشہ (2020)، آتش دان میں خواب (2021) اور اب املاک کی اشاعت 2022 میں عمل میں آئی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کے قوافی جو عام طور پر شعراء استعمال کم کرتے ہیں، زشت، کشت، ہشت، تجرد، تمرد، ترسل، پاکیز (سبزہ زار) انحطاط، پلٹن، امریکی، بک، نجور، لغات، مراقبے، جاپ، شاپ، بلو، منکر نکیر، ہزیمت، انت، منجن، تنگ دل، پست فطرت، سپاس، اُون، ہڑپنے، بھنگڑ، اکھڑ، کیچڑ، جھکڑ، تھپڑ، ہانکا، چوکھا، چیلوں، مستطیلوں یہ ایسے قوافی ہیں جن کو اُن کے حقیقی معنوی انداز میں برتنا ایک کمال ہے۔ عموماً ادبا اُردو اور انگریزی مفردات سے مرکت الفاظ حسب ضرورت بنا لیتے ہیں یا پھر کنایتاً کوئی لفظ یا مترادفات لکھ کر مطلب پورا کر لیتے ہیں مگر سحرتاب رومانی کے ہاں ایسا نہیں ہے۔ وہ لفظوں کو بغیر کسی بگاڑ کے اپنے شعروں میں صف آرا کرتے ہیں۔ یوں سحرتاب رومانی کے اشعار میں سادگی بیان، حسن وعشق کے رنگین وگداز سے کنارا کرتے ہوئے عصرِ رواں کے سچے مسائل، ذاتی تجربات ومشاہدات کے ساتھ دلی جذبات بیان کرتے ہیں۔ وہ اکثر فیس بک پر اپنی تازہ تخلیقات پوسٹ کرتے ہیں اور اس کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے:

شاعری مسئلہ رہے گی مرا
روز تازہ غزل کہوں گا میں

....

اُردو شاعری میں لہجہ اور تلفظ کو اہم مقام حاصل ہے کیونکہ اگر یہ نہ ہوگا تو مصرع پڑھنے میں خارج از وزن معلوم ہوگا۔ حروف کی آواز اور اُن کی ادائیگی اعراب ولہجہ کے مطابق ہی زبان وبیان کی شناخت ہے۔ سحرتاب رومانی نے اس کا پورا پورا خیال رکھا ہے۔

میں کسی بحث میں نہیں پڑتا
بس ذرا قیل وقال چاہتا ہوں

زمین پر ہے نہ وہ افلاک میں ہے
وہ میرے فہم اور ادراک میں ہے

چپ چاپ اُتر جاؤں گا بس قبر میں اپنی
تکفین لکھوں گا نہ میں تجہیز لکھوں گا

....

ماہرین صوتیات کے خیال کے مطابق کہ لفظوں کی مکتوبی صورت ایک ہونی چاہئے اور لفظ کی تحریری صورت کو اُس کے تلفظ کا بالکل صحیح عکس نہیں بلکہ صرف ایک علامت سمجھنا چاہئے جو تلفظ کی طرف ہمارے ذہن کی رہنمائی کرتی ہے۔ سحرتاب رومانی کے ہاں قوافی اور حروف کی صوتیاتی برت بھی ملتی ہے۔ سحرتاب کی ایک غزل میں تقریظ، تجویز، تعویذ، تفویض، دہلیز، پالیز، تجہیز کے قوافی ہم صوت ہیں لیکن یہ ان کا کمال ہنر ہے کہ وہ ان قوافی کے ان کے حقیقی معنوں میں استعمال کرتے ہیں اور روانی سادگی اور خوش بیانی میں پورا اُترتے ہیں۔

تنقید لکھوں گا نہ میں تقریظ لکھوں گا
اس بار کوئی اور ہی تجویز لکھوں گا

.....

روزمرہ کی بول چال، بود و باش، رہن سہن اور دیگر سماجی اقداروں پر گہری نظر رکھتے ہیں اور حادثات زندگی کو اس طرح رقم کرتے ہیں کہ قاری یا سامع پر گراں نہیں گزرتا بلکہ اور اشتیاق بڑھ جاتا ہے۔

مثال کے طور پر:

اب آپ کا جادو نہیں چلے گا
اب لوگ سمجھدار ہوگئے ہیں

خواب ہمارا شہر مدینہ
سوچ ہماری امریکی ہے

زندگی میں بس یہی حسرت رہی
کاش وہ ناگن کبھی ڈستی مجھے

لکھے اشعار میں نے زندگی بھر
یہی کچھ بس مری املاک میں ہے

معلوم تھا اُسے بھی میں خشک آدمی ہوں
اُس نے کبھی مجھے رومانی نہیں لکھا تھا

اپنے سائے سے بھی بچ کے رہنا یہاں
یہ ہزیمت میں ڈوبا ہوا شہر ہے

.....

اُردو زبان میں مختلف زبانوں کے الفاظ جذب ہو چکے ہیں اور وہ اب اُردو زبان کا ہی حصہ ہیں۔ اس میں کوئی اختلاف اب نہیں کرنا چاہئے کہ اردو زبان کا یہ ارتقائی سفر اپنی خصوصی کے حساب سے ختم نہیں ہوگا بلکہ شب روز گزرنے کیساتھ اس کی وسعت میں اضافہ ہوتا رہے گا۔ سحرتاب رومانی کی شعری اُپج میں یہ چیز موجود ہے وہ ہر زبان و لہجے کو سمجھتے ہیں اور اُن حروف کا استعمال احسن طور پر کرتے ہیں:

کروں گا فیصلہ پڑھ کر اُسے میں
ترا وہ خط جواب تک ڈاک میں ہے

میں تجھے یاد کرتا ہوں اور
ہر طرف مون سون ہے مجھ میں

.....

ادبی ماحول میں پیش آنے والے واقعات پر بھی گہری نظر رکھی ہے اور بے جا اشیاء کی جانب نشاندہی یوں کی ہے:

داد مت دے خراب شعروں پر
خوب رو شاعرات سے مت کھیل

.....

یہاں جتنے بھی بے بنیاد شاعر ہیں
مجھے حیرت ہے سب اُستاد شاعر ہیں

.....

بچ گیا مجھ سے جو مقابلے میں
مارا میں نے اُسے مشاعرے میں

وہ غزلیں اب خریدے گا ہمی سے
ہم ہی کچھ نیا پن بیچتے ہیں

.....

محولہ بالا مضامین ایسے ہیں جیسے ادبی دنیا کے باسی اکثر سامنا کرتے رہتے ہیں اور ذوق وشوق سے سنتے بھی رہتے ہیں۔

عباس رضوی کے مطابق سحرتاک رومانی کی شاعری کئی زاویوں سے نئی اور دل آویز ہے، اس شاعری میں نہ تو رنگین دروازے ہیں نہ ہی آرائشی محرابیں، سحرتاب رومانی ضرور ہیں۔ مگر انہوں نے دنیا کو کھلی آنکھوں اور حواس خمسہ کی مکمل بیداری کے ساتھ دیکھا ہے۔ ان کی شاعری میں وہ مصنوعی دنیا کہیں نظر نہیں آتی جس میں ایک خیال محبوب ہوتا ہے اور ہر طرف رنگوں اور روشنیوں کا رقص ہوتا ہے اور شاعر ایک خوابناک الف لیلوی ماحول میں ایک تصوراتی وصال کے عالم میں ہوتا۔ سحرتاب رومانی کی شاعری میں ہمیں زندگی کی تلخ ترین حقیقتیں اپنے اصل دل دہلا دینے والے روپ میں نظر آتی ہیں۔

یہاں یہ بات سو فیصد ثابت ہوتی ہے کہ شاعر کا جذبۂ اظہار اور لفظوں کا بیانیہ اُس کے ذاتی احساسات، جذبات اور اُمنگوں کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ یہ بیانیہ اپنی ذات تک محدود نہیں رکھتا بلکہ خارجی عناصر کو بھی مدنظر رکھتا ہے۔ واردات قلبی اور احساسات کا آہنگ یہی شعری حسن یا جمالیات کا سبب بنتا ہے۔ سحرتاب رومانی کے ہاں شعروں میں منفرد اسلوب بوقلمونی کا پتہ دیتا ہے کہ وہ سماجی ناہمواریوں اور معاشی استحصال پر چپ نہیں رہتے یوں وہ ایک جانب مابعد جدیدیت کے رجحان کے ساتھ ترقی پسندانہ سوچ بھی رکھتے ہیں:

وزرا تو سب عیش کریں گے
قرضہ پاکستان بھرے گا
کیوں آپ اشاروں کے منتظر ہیں
طوفان کوئی اس طرح ٹلے گا

سحرتاب رومانی حالات کے مطابق نالہ بھی بلند کرتے ہیں، شکوہ بھی کرتے ہیں، مگر اس انداز سے کہ نوحہ کناں نہیں لگتے، شہر کی حالت اور برسات کو خدا سے فریاد بھی کرتے ہیں تو دعا کی صورت:

بڑی مخدوش ہے اس شہر کی حالت
اُسے کہنا ابھی برسات کو روکے

.....

خاندانی وسماجی پہلوؤں کو اُجاگر کرنے میں کمال رکھتے ہیں اس سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ وہ معاشرے کے عیوب کو بھی کمال ہنر سے رقم کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

کوئی سنتا ہی نہیں تھا کچھ ہماری
مسئلہ یہ تھا کہ گھر داماد تھے تم

.....

مابعد جدیدیت کے دور میں نئے مضامین غزل، معاشرے کی عکاسی، سماجی عیوب کو احسن انداز میں پیش کرنا، محروم اور اُداس طبقے کی نمائندگی، زندگی کی تلخ یادیں، جمالیاتی کیفیت کو ملال کو رنگ دینا، اشاروں اور کنایوں میں بڑی بات کہہ دینا اور دامن بچانا ہی سحرتاب رومانی کی شناخت بن چکی ہے۔ ان کے قائم کردہ غزلیہ تصورات ان کا انفرادی رنگ ہے۔ اب اس دور میں غزل کی تنگ دامنی کا شکوہ معدوم ہو چکا ہے۔ ان کا فکری شعور، فکر وفن، لفظیات ومضامین کے دائرے وسعت پذیر ہو چکے ہیں۔ سحرتاب رومانی غزل اور دامن غزل کو جدید رجحانات سے ہم کنار کر رہے ہیں، آخر میں ایک منفرد انداز کی غزل، قوافی کا استعمال ملاحظہ ہو:

منزلیں ناگزیر پیتے ہیں
راستے راہگیر پیتے ہیں
روز اک سانپ بچ نکلتا ہے
روز ہم اک لکیر پیتے ہیں
ایک بیدل سے میں سیکھا ہے
کس طرح سے وزیر پیتے ہیں
جال بنتے ہیں پہلے سازش کا
شاہ کو پھر مشیر پیتے ہیں
اور پھر ایک دن یہ ہوتا ہے
بادشہ کو فقیر پیتے ہیں
خود کو دیوار سے ہیں ٹکراتے
اپنے سر کو اسیر پیتے ہیں
کوئی ٹیڑھا جواب مت دینا
ورنہ منکر نکیر پیتے ہیں

املاک یقیناً اُردو شاعری میں ایک معتبر اضافہ ہے، ہم سحرتاب رومانی کو املاک کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا گو ہیں کہ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

☆☆☆☆☆

اسیرِ خواب نئی جستو کے دَر کھولیں

عنبرین صلاح الدین کا شعری سفر نوے کی دہائی سے شروع ہوتا ہے۔ معاصر ادبی، علمی اور تحقیقی منظر نامے پر ان کا نام نمایاں، اہم اور معتبر ہے۔ وہ غزل اور نظم دونوں اصناف میں یکساں عمدگی کے ساتھ لکھتی ہیں، مگر وقت کے ساتھ ساتھ نظم گوئی کی طرف ان کے رجحان میں اضافہ ہوا ہے۔ بے حیا عورتیں، پسِ ساخت، تری آواز کا مرہم، کہانی نہیں تھی، محرم، انتساب، اَنمٹ ریکھا، دریچہ، اگر رستے نہیں ہوتے، ایک اور ادھوری نظم، وغیرہ ان کی چند اہم نظموں میں سے ہیں۔ امیجری، کیفیت اور معنی ان کے بنیادی عناصرِ شعری قرار دیے جا سکتے ہیں اور ان اجزا کی کارفرمائی ان کے معنوی جمالیاتی ارتفاع میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔

وہ 6- مئی 1978 کو لاہور میں پیدا ہوئیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے فلسفہ اور تاریخ میں ماسٹر کیا۔ صنفی مطالعات میں ایم فل اور پی ایچ ڈی کی۔ صنفی مطالعات میں یہ پہلی پاکستانی پی ایچ ڈی ہے۔ سرِ دشتِ گماں (2004) اور صدیوں جیسے پل (2014) کے نام سے ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ فیمینزم اِن ماڈرن اردو پوئیٹس (2005) کے نام سے ریسرچ کی کتاب چھپ چکی ہے۔ آج کل پنجاب یونیورسٹی (ڈیپارٹمنٹ آف جینڈر سٹڈیز) میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر خدمات سرانجام دے رہی ہیں۔

ذیل میں ان کا مختصر سا شعری انتخاب جس میں تین نظمیں بھی شامل ہیں:

شاہد ماکلی

بس ایک بار ہی آنگن سے آسماں دیکھا
بلند ہو گئی دیوار پھر حویلی کی

ملیں گے اُس سے کہیں دوسرے کنارے پر
سراب پار کریں گے، سراب دیکھیں گے

اسیرِ خواب نئی جستجو کے در کھولیں
ہوا پہ ہاتھ رکھیں اور اپنے پَر کھولیں

فضا میں دور تلک گونجتی صدائیں تھیں
سمجھ نہ آئی کہ کس نے کسے پکارا تھا

جہانِ حرف و معانی میں جس نے اُلجھایا
ہم اُس کے ہاتھ میں اپنی کتاب دیکھیں گے

اُس کے لفظوں کے مقابل مَیں بھلا کیا کہتی
میں نے حیران ہی رہنے میں سہولت دیکھی

حرف در حرف مرے دل میں اترتا آیا
مجھ سے پہلے مرے الہام نے دیکھا اس کو

ٹکٹکی ایسی بندھی ہے ترے رستے پہ، اگر
آنکھ جھپکے تو وہیں اُس کی تھکن جم جائے

آنکھ کے کٹورے میں ریت بھر گئی ہے کیا
کشتیوں میں کائی ہے، ساحلوں پہ پانی ہے

اپنے خواب کے ہاتھوں میں تکلے کی نوک چبھو لیں
کسی محل کے سناٹے میں ایک صدی تک سو لیں

اس کی لکھی کہانی سے باہر نکل
ورنہ انجام اچھا نہیں ہے بہن

تیری خود سے شناسائی کیسے نہیں
تیرا خود سے تو پردہ نہیں ہے بہن

آپ اگر فیصلہ کر لیں تو اٹھا لوں ان کو
شب کی دہلیز پہ جو خواب پڑے ہیں صاحب

کب یہ کہسار ہیں اونچے مرے آدرشوں سے
کب سمندر مرے خوابوں سے بڑے ہیں صاحب

آج پوچھے نہ کوئی صبر کے معنی ہم سے
آج ہم آخری منزل پہ کھڑے ہیں صاحب

فاصلے سارے ایک نظر میں مٹ جائیں
وقت ہمارے بیچ کہیں حائل نہ رہے

زمیں کی دھڑکنیں پہچان لینا
کوئی دیوار بنوانے سے پہلے

کرن لفظوں کی چمکے اور ہوا کا ساز ہو جائے
مرے ہاتھوں سے لپٹی یہ دعا آواز ہو جائے

آپ کہیں تو تین زمانے ایک ہی لہر میں بہہ نکلیں
آپ کہیں تو سب باتوں میں ایسی ہی آسانی ہے

کیا تم پہلے خواب کا دوسرا منظر ہو
یا پھر دوسرے خواب کا پہلا منظر ہو

اس کا موڑ بھی ایک پہاڑی رستہ ہے
اگلے موڑ پہ جانے کیسا منظر ہو

یعنی میں ہوں نصف تمہارے منظر کی
یعنی تم بھی ایک ادھورا منظر ہو

دیکھ رہے ہیں جو دکھلایا جاتا ہے
پس منظر میں جانے کون سا منظر ہو

میں تو تمہارے سب رنگوں سے واقف ہوں
تم تو میری آنکھ سے نکلا منظر ہو

یہ کوئی خواب کروٹ لے رہا ہے
کہ میں بیدار ہوتی جا رہی ہوں

عنبرین ایک ہے ، بکھیڑے تو
اور گزر بھی گیا ہے آدھا دن

اک ہزار راتوں تک کس طرح سنانی ہے،
میرے پاس شہزادے ایک ہی کہانی ہے

اور اس کہانی کے حرف اولیں میں ہے،
طائر یقیں میں ہے، میری جان شہزادے!

ہمیں ملنا ورقوں سے پگھلتی برف دھانی ڈھلوانوں میں جب بدل جائے
ہمیں ملنا ہمارے دل میں ٹھہرا زمہریری وقت شاید جب بدل جائے

ہمیں ملنا ہے امکان سے، یعنی ہے قصے، ہے عنوان سے ملنا
ہمیں ملنا کہ جب مطلب کے سب الفاظ اور الفاظ کا مطلب بدل جائے

یہاں ممکن کو ناممکن کے ریلے کا بہاؤ کچھ سمجھ آنے نہیں دیتا
یہاں صحرا میں ساگر اور ساگر میں جہاں ساگر نہ جانے کب بدل جائے

تماشا گر، ہمارے آنکھوں پہ گرد ہے، تیرا تماشا بھی پرانا ہے
کچھ ایسا کر، ہماری بینائی ٹھیک ہونے تک ذرا کرتب بدل جائے

ترے لہجے کا زیر و بم میں اکثر جانچتی ہوں اور ترے الفاظ گنتی ہوں
بھلے تعداد سے معیار افضل ہے مگر معیار جانے کب بدل جائے

....

1- بے حیا عورتیں

کیسے مردوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بنا کر
گلے کو دبا کر
تعفن اگلتے ہوئے گندے نالوں میں لڑھکاتی،
یا دور کھیتوں میں اور کوڑے دانوں میں پھینک آتی ہیں
سنگ دل سارے منظر کو اک آن میں بھول
کر آگے بڑھ جاتی ہیں

بے حیا عورتیں

فاحشہ عورتیں
ان کی رالیں ٹپکتی ہیں
معصوم جسموں کو گر دیکھ لیں
مرد، عورت ہو یا کوئی خواجہ سرا
اپنی وحشت کی تسکین کے واسطے
عمر، رنگت، قبیلے یا طبقے کا کچھ مسئلہ ہی نہیں
جان سے مار دینا بھی مشکل نہیں
بلکہ قبروں میں تازہ دبی لاشوں کو نوچنے میں
انہیں ہچکچاہٹ نہیں
یہ بلا عورتیں

وحشیہ عورتیں
اپنی غیرت کے سارے تقاضے بھلاتی ہیں اور دا دپاتی ہیں
کس کو بھلا اتنی جرات کہ ان کے پیاموں کو ٹھکرائے
تیزاب کی پوری بوتل الٹ دیتی ہیں
اور جواں سال مردوں کے نازک بدن ایسے جل جاتے ہیں
بچنے والے بھی مرنے کی خواہش میں جیتے ہیں
اور عمر بھر اپنے چہروں سے چھپتے ہیں
ان کے لیے ہیں اذیت بھری اک سزا عورتیں

منبروں پہ کھڑی
برتری کے مناروں سے مردوں پہ پھنکارتی
زعم میں مبتلا عورتیں
خود کو کیسے برابر سمجھتے ہیں؟۔۔۔
کیا؟ عورتوں کے برابر؟
خدا ان کو بخشے۔۔۔
کہ یہ عورتوں کے تو پیروں کی جوتی برابر نہیں
عقل ٹخنوں میں ہے
اور سب جانتے ہیں
قیامت کے دن یہ جہنم بھریں گے
مگر یہ نہیں جانتے
عورتوں کے تخیل کی جنت میں اٹکھیلیاں کر رہے ہیں
بیٹر حسیں، کسرتی جسم کے اونچے لمبے جواں
جن کے ملبوس سے ان کے جسموں کی رگ رگ دھڑکتی نظر آتی ہے!
اور اس انعام پر
خود پہ اتراتی ہیں
کج ادا عورتیں

باحیا، پارسا، باصفا مرد ہیں
اور ان کی مجازی خدا عورتیں!

.....

2- پسِ ساخت

باریکی سے لفظوں کی ترتیب لگاتے
ہاتھ کے پیچھے چھپ کر دنیا دیکھتے مشکن *!
ایک کتاب میں چھپ کر رہنا اچھا ہوتا ہے
دلچسپی سے تم پر باتیں کرتی دنیا
تم کو لفظوں سے حرفوں میں،
حرفوں سے امکان کے لمحوں میں تقسیم کیے جاتی ہے

کیا اِس خال وخد کے ٹکڑے کر دینے سے،
یہ انبوہ سوالوں کا اور اِن کا خلا بھی مٹ جائے گا؟

مِشکن، تم اِک لفظ نہیں ہو
تم تو لفظ کے پیچھے چھپ کر دنیا دیکھنے والی آنکھ ہو
لفظوں کی تقسیم میں صدیاں بوجھل کرنے
والے کب یہ جان سکیں گے
جیسے جیسے تم پر صدیاں بیت رہی ہیں
ویسے ویسے تم دُنیا سے صدیوں دور ہوئے جاتے ہو!

آئندہ تو یہ امکان بھی نہیں رہے گا
کوئی کہے گا
اِک کردار ہے — اچھا ہے اور سچا ہے
اِس کو توڑیں،
توڑ کے دیکھیں،
اِس کے پیچھے کیا رکھا ہے---

دیکھو مِشکن!
ایک تمہارا سچ ہے جس میں
اِک انبوہ سوالوں کا اور اِن کا خلا ہے!
جب تک ایک کتاب بھی دنیا میں باقی ہے
اُس کے اندر چُھپ کر رہنا ہی اچھا ہے!

from Myshkin *Prince
Idiot "The Dostoevsky's

3-اک اور ادھوری نظم

میں نے نظم لکھنی شروع کی
ماں نے روٹی بیلنی شروع کر دی
میری نظم کی ہر سطر میں
پڑے بیلن کی آواز سکتے پیدا کرنے لگی
میں نے کمرے کا دروازہ بھیڑ دیا
میری ماں نے میری نانی کی طرف دیکھا
اور اس سے پہلے کہ میں دروازہ پورا بند
کرتی، اس نے کہا
''عمر بھر کتنے دروازے بند کرو گی''
میں نے نظم کو دونوں مٹھیوں میں بھینچ کر پھیلایا
تازہ روٹی کی مہک فضا میں پھیل گئی
اور نظم کے حروف خشکے کے ساتھ اڑ گئے

میں نے نظم لکھنی شروع کی
ماں نے صحن میں پانی چھڑکنا شروع کر دیا
میری نظم کی ہر سطر لفظ در لفظ بکھرنے لگی
میں نے آدھا ورق پھاڑ دیا
میری ماں نے میری نانی کی طرف دیکھا
اور اس سے پہلے کہ میں وہ صفحہ کوڑے دان
میں پھینکتی، اس نے کہا
''کاغذ کے ٹکڑے کرنے سے لکھا ہوا کب مٹتا ہے''
میں نے کاغذ کی ناؤ بنائی اور صحن میں بہتے
پانی میں اتار دی
گیلی مٹی لفظوں کے حلق میں چبھنے لگی
اور نظم پانی کے ساتھ بہتی ہوئی دہلیز پار کر گئی
میں نے نظم لکھنی شروع کی

ماں نے سوئی میں دھاگہ ڈالا اور سفید
کپڑے پر رنگین کڑھائی کرنے لگی
میری نظم کی ہر چھوٹی بڑی لائن کہیں کہیں
سے ادھڑنے لگی
میں نے حرفوں کا سرا پکڑ کر کھینچا
میری ماں نے میری نانی کی طرف دیکھا
اور اس سے پہلے کہ میں پورا بخیہ ادھیڑ دیتی،
اس نے کہا
"ادھیڑنا آسان ہے مگر دوبارہ سینا بہت مشکل ہے"
میں نے دھاگے کو کھینچ کر گرہ لگائی
میز پوشوں، تکیوں کے غلافوں اور ٹکوزیوں
پر رنگا رنگ بیل بوٹے اگ آئے
نظم سوئی کے ناکے سے ٹانکہ ٹانکہ گزرتی
ہوئی کئی ٹکڑوں میں بٹ گئی

میں نے نظم لکھنی شروع کی
ماں نے پرانے ٹرنکوں سے نکلے نانی کے
کپڑے اپنے دل میں سنبھالنا شروع کر دیے
میری نظم کی لائنیں بوسیدہ مہک اور پیلے
اخباری کاغذوں کی تہوں میں دب گئیں
میں نے فائل کی گولیوں کے ریزے نظم کی
تہہ سے اکٹھے کیے
میری ماں نے میری نانی کے کروشیا کی
بیلوں سے سجے دوپٹوں اور جاپانی سوٹوں کو
آخری بار دیکھا
اس سے پہلے کہ میں فائل کا برادہ نظم کی
یادداشت سے جھاڑ دیتی، اس نے کہا
"چیزیں بنانا مشکل کام ہے اور انہیں
سنبھالنے کا کوئی فائدہ نہیں"
پھر پورے گھر میں سے زنگ آلود تالے، بوسکی
کے سوٹ، موتیا اور پرفیمی کی مہک، سفید
دوپٹے اور انگریز کے دور کے برتن سٹور کی
پڑچھتیوں پر گم ہو کر ماں کے دل میں چھپ گئے
نظم نئی اور پرانی تصویروں، اور ایمبولینس
کے اندر اور باہر کے منظر میں منقسم ہو گئی

میں نے نظم لکھنی شروع کی
اس بار ماں نے کچھ کہا نہ کیا
وہ چپ چاپ نانی کے ساتھ نظم کی
ایمبولینس میں بیٹھ گئی
لفظ سائرن کی آواز میں گم ہوتے گئے
میں نے سٹریچر پر پڑی اکھڑتی سانسوں پر لفظ پھونکے
پرانے بکسوں میں سینت کر رکھے نانی اور
ماں کے ہیولوں کو گڈمڈ ہوتے دیکھا
آخر کار سائرن کی گونج میں ہر آواز گم ہو گئی
میں نے لفظوں کو پہلی بار مکمل سناٹے میں
بے حس و حرکت بیٹھ کر بُنا
ایک اور ادھوری نظم لکھنے کے لیے

☆☆☆☆☆

آکسیٹوسن

کبھی پالتو بلی وغیرہ کے جسم پہ ہاتھ پھیریں۔ وہ ہر سانس کے ساتھ غرغر، غرغرغر کی آواز نکالنا شروع کر دے گی۔ آنکھوں میں نشے کا احساس ہوتا ہے۔ بعض اوقات تو ہاتھ پھیرنا بند کر دیں تو بُرا بھی مناتی ہے۔ یہی عمل کسی بچے کے سَر پر دہرائیں۔ اسے بھی سکون کا احساس ہوتا ہے۔

حسبِ توفیق اگر کوئی محبت میں اپنے چاہنے والے کے بالوں میں انگلیاں پھیرے تو بھی اسے سکون ملتا ہے۔

بعض اوقات تو اس "سکون" کی addiction سی ہو جاتی ہے اور بندہ ندیم بھابھہ کی زبان میں کہتا ہے؛

ع

انگلیاں پھیر میرے بالوں میں
یہ مرا دردِ سَر نہیں جاتا

.....

اب بھلا اس لمس کی مسیحائی کی بات ہو تو پروین شاکر کو کون بھول سکتا ہے!

ع

اس نے تپتی ہوئی پیشانی پہ جب ہاتھ رکھا
روح تک آ گئی تاثیر مسیحائی کی

.....

آیئے جائزہ لیں کہ کیا شعراء نے اپنے اشعار میں یہ بے پَر کی چھوڑی ہیں یا لمس میں واقعی کوئی تاثیر نام کی چیز ہوتی ہے؟

قارئین کرام، دراصل سارا کھیل بائیو کیمسٹری کا ہے۔ جب ماں، ابا جان، یا کوئی اور چاہنے والا آپ کو پیار سے چھوئے تو دماغ کے ایک حصے سے آکسی ٹوسن نامی ہارمون خون کی نالیوں میں گردش کرتا ہے جس سے سکون بلکہ محبت پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے اسے محبت کا ہارمون کہا جاتا ہے۔ ایک بار شاعروں کی محفل سجی ہوئی تھی۔ ہم نے آکسی ٹوسن کی افادیت کا ذکر کیا تو مزاح کے ایک شاعر بولے؛

"بھائی جان، میری طرف سے آکسی ٹوسن کا ایک کارٹون بک کروا دیں۔"

تجربات سے ثابت ہو چکا ہے کہ جانوروں (یا انسانوں) میں آکسی ٹوسن کی کمی ہو وہ محبت سے عاری ہو جاتے ہیں۔ بھینس یا گائے وغیرہ کے پستان کو جب ان کا بچہ چھوئے تو آکسی ٹوسن پیدا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں دودھ ان کے پستانوں میں اترتا ہے۔ بعض ظالم قسم کے گوالے بھینسوں کے بچے کو جلدی ذبح کر دیتے ہیں اور بھینس کا

صغیر احمد صغیر

دودھ دوہنے کے لیے اسے آکسی ٹوسن کا ٹیکہ لگاتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس طرح کے دودھ سے انسانوں کی صحت پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

آکسی ٹوسن کے ساتھ ساتھ ڈوپامین Dopamine ، اینڈارفنز Endorphins, اور سروٹونین serotonin بھی انسانی جسم کی تر و تازگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ڈوپامین کو chemical Reward کہا جاتا ہے۔ اگر آپ اپنی پسندیدہ خوراک کھائیں یا پئیں (یا "کوئی" چاہنے والا کھلائے یا پلائے) تو ڈوپامین دماغ سے پورے جسم میں پھیل جاتا ہے۔ ہم اسی لیے کئی بار دوستوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ "اپنی" بیوی کے منہ میں نوالہ ڈالا کریں وہ ڈوپامین سے مالا مال رہے گی۔ (گھر میں سکون رہے گا)

تجربات سے ثابت ہوا ہے کہ چھوٹی یا بڑی کامیابی کے بعد بھی ڈوپامین کثرت سے پیدا ہوتا ہے۔ اس کا مطلب ہے اگر آپ کسی کی مدد کریں تو مدد کرنے والے اور جس کی مدد کی جائے، دونوں میں ڈوپامین پیدا ہو گا۔ لہٰذا خود کو خوش کرنے کے لیے دوسروں میں خوشیاں بانٹنا لازم ٹھہرا۔

علاوہ ازیں اپنا خیال رکھنے مثلاً پسندیدہ لباس پہننے یا میک اپ کرنے سے بھی ڈوپامین پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میک اپ کرنے والی خواتین ہشاش بشاش رہتی ہیں۔

اسی طرح اینڈارفنز درد کو رفع کرتے ہیں۔ اگر آپ ورزش کریں تو یہ بائیو کیمیکل پیدا ہوتے ہیں جو درد سے سکون کا باعث بنتے ہیں۔ ہم نے ایک مضمون میں اس بات کا ذکر کیا تھا کہ پینا ڈول کے بجائے اگر آپ کا کوئی بھی پیار کرنے والا اگر آپ کی مسکراہٹ کا باعث بنے تو اینڈارفنز آپ کے خون میں پھیل جاتے ہیں۔

ع

جہاں سے بھی چاہو دوائیں لیتے پھرو
تمہیں جو مسئلہ ہے اس کا حل محبت ہے

کبھی مطالعہ کے دوران ایسا ہوا ہے کہ کسی پیارے کی یاد یا کوئی واقعہ یاد آ جائے اور مسکراہٹ آپ کے چہرے پر پھیل جائے۔ بالکل آپ درست سمجھے۔ یہ اچھی یاد بھی ایک بائیو کیمیکل سروٹونین کے افراز کا باعث بنتی ہے۔ اسی طرح چہل قدمی، یوگا، مراقبہ اور چاہنے والے کے ساتھ گپ شپ کے دوران بھی سروٹونین پیدا ہوتا ہے۔ یہ عجیب امر ہے کہ جانوروں میں عمل تناسل کے دوران آکسی ٹوسن، ڈوپامین، سروٹونین اور اینڈارفنز بیک وقت کثیر مقدار میں پیدا ہوتے ہیں۔

آخر میں، بس ایک بات یاد رکھیں۔ بُری یادوں کو بھلا دیں۔ ورنہ دکھ کے ہارمون پیدا ہوتے ہیں۔ (ان دکھ والے ہارمونز کا ذکر کبھی پھر سہی)۔

☆☆☆☆☆

نہ لکھوں گی تو مر جاؤں گی۔۔۔۔

ایک تعزیتی تحریر

سانحہ، حادثہ، المیہ، قیامت صغریٰ کیا ہوتی ہے؟ اس سے پہلے معلوم نہ تھا۔ پاوں کے نیچے سے زمین کیسے نکلتی ہے؟ کبھی نہیں جانا تھا۔

پیر کی شام چار بجے اپنے پیارے بھانجے ولید کی حادثاتی موت کی اچانک خبر نے مجھے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم کر دیا اور میرے منہ سے بس اتنے لفظ ادا ہو سکے ۔۔۔۔ کون سا ولید؟ اور جو جواب ملا۔۔۔۔ وہ میری جان نکالنے کے لیے کافی تھا۔ اس سے پہلے محض نیوز چینلز پر حادثاتی اموات کی خبریں سنیں یا اخبارات میں پڑھی تھیں۔ جن پر دکھ کے الفاظ سطح سے گہرائی کی جانب نہیں جاتے تھے۔ افسوس ضرور ہوتا تھا اور میں ہمیشہ یہ سوچا کرتی تھی کہ گھر والوں پر کیا قیامت گزرتی ہوگی۔ کسے خبر تھی کہ ایسے ہی ایک سانحے سے ہم بھی دوچار ہوں گے؟

ولید کی حادثاتی اچانک موت کی خبر سن کر جلد از جلد گاڑی کا رخ اپنی بہن کے گھر کی جانب موڑ دیا جو کہ پانچ منٹ کی مسافت پر تھا۔ سارے راستے یہی دعا کرتی رہی کہ یا اللہ یہ خبر جھوٹ نکلے۔ جیسے تیسے گھر پہنچے تو گھر کے باہر کچھ لوگ جمع تھے۔ گاڑی سے اترتے وقت میرا دل اس قدر زور سے دھڑکا جس کا بیان ممکن نہیں۔ گیراج سے اندر داخل ہوتے ہی ٹی وی لاونج میں پہلی بار قیامت خیز منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا۔ ولید کی میت چارپائی پر پڑی تھی۔ یہ وہی ولید تھا جو کے پیدائش کے بعد میرے ہاتھوں میں آیا تھا۔ میں اس وقت میٹرک کی طالبہ تھی اور اس ننھے بچے کو سنبھالنے کی

سیدہ آمنہ ریاض

ڈیوٹی خوشی خوشی ادا کرنے لگی تھی۔

اب کہ جو منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا وہ ناقابل بیان تھا۔ آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہ تھے۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میں اپنے ولید کو اس حالت میں دیکھوں گی؟ چند لمحوں تک مجھے لگا کہ شائد کوئی معجزہ رونما ہو جائے۔ شائد ولید ہنستا مسکراتا اٹھ جائے اور کہے کہ دیکھا بنٹی خالہ (مجھے پیار سے گھر والے بنٹی کہتے ہیں) کیسا پرینک کیا ہے؟ اور میں اس کے سر پر چپت لگا کر کہوں گی کہ الو کے پٹھے! اتنا جان لیوا پرینک اب کبھی مت کرنا۔

لیکن یہ نہ تو کوئی پرینک تھا اور نہ ہی خواب ---- بلکہ یہ وہ حقیقت تھی جس کو جھٹلایا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ولید کے چہرے کو تکنے کے بعد یک دم ولید کی ماں کی جانب دیکھا ---- جس کو تین چار عورتیں سنبھال رہی تھیں ---- جو شدت غم سے نڈھال تھی ---- جس کے منہ سے بس یہ الفاظ نکل رہے تھے ---- یا اللہ رحم ---- یا اللہ رحم!!! میں نے سوچا کہ میں کس طرح اس کا سامنا کروں گی؟ اپنی بہن کا دکھ کیسے بانٹوں گی؟ کیسے مجھ میں اتنا حوصلہ آئے گا؟ خیر ہمت کر کے آگے بڑھی اور اپنی بہن کو سینے سے لگایا --- ہمت دلانے کی سوچ تو آئی ہی نہ --- کہ --- کیسے اس کو کہوں کہ صبر کرو - - - کیسے کہوں کہ اللہ کی مرضی --- کیسے کہوں کہ حوصلہ کرو --- یہ سب کچھ تو خود بھی نہ کر پائی ---

ولید کامسیٹ یونیورسٹی میں بی ایس کا وہ واحد طالبعلم تھا جس نے اپنی یونیورسٹی میں پہلا بہت بڑا کارشو کروایا تھا۔ جس کی ہر طرف دھوم مچ گئی تھی۔ شروع سے ہی ولید اپنے ساتھی بچوں سے کچھ مختلف تھا۔ اس کی باتیں سب سے ہٹ کر ہوتی تھیں۔ ہر کوئی یہ کہتا تھا کہ یہ کوئی عام بچہ نہیں ہے۔ اوائل عمری میں ہی یہ بچہ بہت سنجیدہ طبیعت کا مالک تھا۔ گاڑیوں کا شوق اس کی رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ کونسی گاڑی کس ماڈل کی ہے؟ گاڑی کا لیٹیسٹ ماڈل کونسا ہے؟ علاوہ ازیں گاڑیوں کی قیمتیں ان کا بکنا خریدنا ---- یہ وہ معلومات تھیں جو ولید کو ازبر تھیں۔ ہم اس کی یہ باتیں سن سن کر بہت محظوظ ہوتے تھے۔ بلکہ قریبی رشتے دار گاڑیوں کی معلومات کے لیے ولید سے ہی مشورہ کرتے، جو کہ سو فیصد درست ثابت ہوتا۔

علاوہ ازیں اس قدر عزت کرنے والا بچہ میں نے نہیں دیکھا جو ہر شخص سے انتہائی ادب و احترام سے جھک کر ملتا ہو۔ جس کی

آنکھوں میں بلا کی ذہانت ٹپکتی تھی اور کیوں نہ ہو جس کے ماں باپ اتنے لائق --- نانا اس قدر ذہین ------ اس لحاظ سے بھی ولید کا ذہین اور شریف ہونا تو قدرتی تھا۔

مجھے یوں لگتا ہے کہ قدرت کچھ لوگوں کو شروع سے ہی چن لیتی ہے۔ شہادت کا درجہ ایسے ہی نہیں مل جاتا۔ جس دن ولید کی وفات ہوئی اس دن تیسواں روزہ تھا اور ولید روزے سے تھا۔ ظہر کی نماز ادا کر کے باوضو حالت میں اپنی یونیورسٹی سے اپنے دو دوستوں کے ہمراہ گاڑی میں گھر واپس آنے کے لیے نکلا کہ راستے میں اس کو ایک ہولناک حادثے نے آلیا۔ جو کہ جان لیوا ثابت ہوا۔ حادثے کی یہ خبر سوشل میڈیا پہ دیکھتے ہی دیکھتے وائرل ہو گئی۔ حقیقت میں یہ ایسا سانحہ تھا جس پر ہر آنکھ اشکبار تھی۔ پورے شہر کی فضا سوگوار تھی۔ جو لوگ جنازے میں شریک تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ ساہیوال کی تاریخ کا بہت بڑا جنازہ تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے فرشتے اس جنازے میں شامل ہوں۔ باہر سڑک تک لوگوں کو جگہ نہیں مل رہی تھی۔ لوگ اُمڈ اُمڈ کر جنازے میں شامل ہو رہے تھے۔

گھر پر تعزیت کرنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ولید کی کلاس فیلوز سے اس کی وہ وہ باتیں پتہ چل رہی تھیں جو اس سے پہلے نہیں معلوم تھیں۔ جس پر میں سوچنے لگی کہ یا اللہ اس بچے کو تو نے اتنا بڑا مقام دے دیا-- میں رشک کرنے لگی کہ ہر ہر شخص ولید کی تعریف میں رطب اللسان تھا۔ بیس سالہ زندگی میں شاید ولید وہ کام کر گیا جو لوگ سو سال میں بھی نہ کر پائیں۔ تو پھر کیوں نہ کہوں کہ اللہ پاک نے اس کو شہادت کے لیے ہی چن رکھا تھا۔ جس کی گواہ ولید کی وہ آخری مسکراہٹ تھی۔ اس کے چہرے پر ایسا سکون تھا جو میں نے ساری زندگی نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً وہ ایک شہید کا چہرہ تھا۔ جس کے چہرے پر نور ہی نور تھا۔

ولید --- بیٹے ---- سچ ہے --- ہم آپ کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے ---- آپ کا ہنستا مسکراتا چہرہ ہمیشہ ہماری نظروں کے سامنے رہے گا--- اللہ پاک سے دعا ہے کہ وہ آپ کے درجات بلند فرمائے اور لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے آمین۔

مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں
وہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
مرنے والوں کی جبیں روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

☆☆☆☆☆

تبصرہ ــ سفرنامہ ''کوسوؤ''

سفری تلخیوں کے سمندر کے بھنور میں ہچکولے کھاتی کشتی میں بیٹھا مسافر ''غلام رسول زاہد'' دنیا و مافیہا سے بے نیاز عشق رسولؐ کی لو دل میں روشن کیے ہوئے، اپنی تحریر کے دھیمے اور مسحور کن انداز سے قاری کی درماندگی کو سفری خوشبویات سے معطر کرتا ہوا، ایسی داستان رقم کرتا چلا جاتا ہے، جس کے لفظ لفظ سے قاری مخمور ہوتا چلا جاتا ہے۔
سرکاری فرائض منصبی کی بجا آوری کے ساتھ ساتھ سفری میں موجودات میں درپیش حالات اور مناظر کی تصویر کشی ''اپنی چشم حسن'' میں سمو کر صفحہ قرطاس پر ایسے نقش کر دینا کہ تمام دھندلے مناظر عکس عکس، لمحہ لمحہ لو بن کر چمکنے لگیں۔ کسب تحریر کا کمال فن ہے۔
ایک خوبصورت خیالی یا حقیقی مصوری شاہکار کی تصویر کشی سے سفری روداد کا ابتدائیہ ہی مصنف کی زبان دانی، حسن تحریر اور جذبوں کی خوبصورتی روز روشن کی طرح واضح کر دیتا ہے۔
''کوسوؤ'' کے لفظ کے اندر معنوی وسعت پنہاں ہے، جسے سرسری نظر میں ''کوسوں'' سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔
سفر گھر سے دوری کا نام ہے اور وہ چند کوس ہوں یا کوسوں پر مشتمل کوسوو، بہر حال سفر، اپنے قرب و جوار سے ناآشنا ہوتا ہے اور اپنی چوکھٹ، جہاں سے وہ عازم سفر ہوتا ہے۔ وہ چند خیالوں کے مدّ وجزّر کے ساتھ بلند ہوتے خدشات اور اندیشوں کی لہروں میں چاندنی پر نظر جمائے رکھتا ہے۔
موصوف نے گھر سے جدائی کے منظرنامے کو خوبصورتی سے رقم کیا۔ دبئی ایئرپورٹ کے احوال سے ''فلش بیک'' کا آغاز ہوتا ہے اور امارات کے تاریخی پس منظر کو لفظوں میں خوبصورتی سے سموتے ہوئے، استنبول کے عجائب خانہ اور تبرکات مقدسہ کی زیارت کی تشنگی کے ساتھ اپنے قاری کو اپنے ساتھ ہوائی جہاز میں بیٹھا کر کوسوو روانہ ہو جاتے ہیں۔
کوسوو میں 'غلام رسول زاہد' ایک لمحہ کے لیے بھی استراحت کو نزدیک بھٹکنے نہیں دیتے اور نہ قاری کے آرام کا خیال کرتے ہیں، بلکہ قاری اپنے باطن میں ان کے ساتھ ہمسفری کی لذّت اپنے دل و دماغ میں پیوست کیے کسی ''کن فیکون'' کا منتظر دکھائی دیتا ہے۔ مگر موصوف فرماتے ہیں:
بھائی ذرا صبر! ادبی کائنات میں تخلیقات خالق کُل کے ''کن فیکون'' کی طرز نہیں ہوتیں۔ کسب سفر کی کارگزاریاں ہی گلوں میں رنگ بھرتی ہیں اور لفظ لفظ کسب سعی کے لیے سفری صحراؤں میں آب یاری کی گرانی سے خار مغیلاں سے نذرانداز ی تک کٹھن ''ریاضت'' قبولِ دل و بدن کے لیے لازم ہے۔

عبدالرؤف کیانی

سفرناموں میں چاشنی، تاریخی نوادرات، قدرتی عجائبات اور فطری مناظر کی حسن گری خوبصورت بیانیہ سے پیدا کی جاتی ہے، مگر موصوف نے سابقہ یوگوسلاویہ اور موجود سربیا کے خودمختار صوبے کوسوو کی پچیس لاکھ کی آبادی میں دوشیزاؤں کے حسن، یورپی ماحول، صنف نازک کی یورپ میں مانگ کے قصوں اور رسم و رواج، ثقافت معاشرت، مذہب اور ماحول کو خوبصورت انداز میں قلم بند کیا ہے۔

پورن نامی ہندو کی تین بیویوں، جس میں ایک مسلمان بھی ہے اور وہ مسلمان عورت اور ان کے مرحوم شاہ حسین کی قریبی عزیزہ ہے۔ ایسے قصے سے قاری کو حسرت و استعجاب کی کیفیت سے گزارا۔ تاریخی عجائبات میں "لپیان" کے نزدیک "گادی ما" نامی گاؤں میں قبل مسیح غار کا تذکرہ قاری کو قبل مسیح کے دور میں خیالی سفر نگاری کی "تلطف آمیزی" سے آشنا کرتا ہے۔

دنیا کے کئی ممالک میں دوشیزاؤں کو روزگار کے جھانسے سے اس خطے میں فروخت کے قصوں سے لے کر، دوشیزاؤں کی بے بسی اور خودافزیتی اور موت کے رقص کے قصے درد دل کے ساتھ کتاب کے صفحات میں پروئے گئے۔

زار سیموئیل کے تعمیر کردہ ازمنہ وسطیٰ کے "قلعہ مخدونیہ" کی طویل و عریض فصیل اور پہاڑی کا قصہ جہاں شہر کو اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے وہیں قاری کے ذہن کے گرد "سفرنامہ" کی دلچسپی کا حصار لطف و عنایت سے بہرہ مند کرتا ہے۔

سفرنامہ، شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال، شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی اور واصف علی واصف کے فرمودات اور قصوں سے سجی علمی محافل ایسی متصوفانہ روح پروری کی مشغولیت کا قصہ بھی ہے اور سفرنامہ نگار کی علم دوستی کا ثبوت بھی۔

نصرت فتح علی خان کی موسیقی دھن کی شہرت اور عقیدت سے ملک پاکستان کے سپوت پر قاری کو پڑھتے ہوئے فخر ہوتا ہے۔

سفرنامہ میں ایک افسر سے مکالمہ میں "قونیہ" اور "مولانا جلال الدین رومیؒ" کا ذکر قاری کو سفرنامہ کے نئے طرز نگاری سے آشنا کرتا ہے۔

ایسی ہی ایک ملاقات میں "ملا نصیر الدین" کا قصہ دلچسپ پیرائے میں قاری کے دل کو موہ لیتا ہے۔

پڑوسی ملک بھارت کے معروف گورد "اوشو" کا تذکرہ بریٹش آرمی، اقوام متحدہ کی افواج اور پاکستانی افسروں کی رغبت، فراغض اور کوسوو کے بلند آہنگ ماحول، ہنگامہ خیزیوں، رنگینیوں اور نشاط و عشرت کے قصے ایسے سر بلند انداز اختیار کیے ہوئے ہیں گویا قاری، آخری صفحہ کے اختتامی جملے پڑھتے ہوئے سفری ماحول، رہن سہن اور انوکھے انداز بیان سے "ہیپا ٹائز" ہو جاتا ہے وہی سفری لگاؤ، تھکاوٹ اور کوسوو چھوڑنے کا دکھ اور وطن واپسی کی مسرت ایسے ملے جلے جذبات کا اسیر ہو جاتا اور اسے اس بات کا شائبہ ہونے لگتا ہے کہ وہ کوسوو میں ایک سال بسر کر کے وطن عظیم کو پلٹ آیا ہے۔

☆☆☆☆☆

کتاب.....واپس ضرور کر دینا

مختلف ادیب و شاعر حضرات جب اپنے کسی دوست، قریبی عزیز یا ساتھی لکھنے والے کو کتاب پڑھنے کے لیے دیتے ہیں تو عموماً کہتے ہیں کہ ''کتاب پڑھ کر جلدی واپس کر دینا'' یا ''کتاب لے جاؤ مگر واپس ضرور کر دینا'' یا یہ کہ ''میں پڑھ رہا تھا، چلو پہلے تم پڑھ لو مگر جلدی دے جانا'' وغیرہ وغیرہ۔ پوسٹ آفس میں ملازمت کرنے والے میرے ایک شاعر دوست نے دو ماہ پہلے بورے والہ کے ہی ایک معروف شاعر کی کتاب پڑھنے کے لیے دی۔ میں نے خود اس سے کتاب مانگی تھی۔ کیونکہ میں گزشتہ سال دنیا سے چلے جانے والے اس شاعر پر مضمون لکھ رہا تھا۔ کتاب لے کر رکھ لی اور بھول گیا۔ کتاب اخبارات و رسائل کے پلندے کے نیچے چلی گئی۔ گزشتہ دنوں اس دوست نے یاد دلایا کہ بھائی اتنی دیر ہوگئی ہے۔ وہ کتاب واپس نہیں آئی۔ میں نے کہا میں بھول گیا۔ آج ہی موبائل میں ریمائنڈ لگاتا ہوں۔ چند دن میں مضمون لکھ کر آپ کو پیش کرتا ہوں۔ گھر آ کر اخبارات کے ڈھیر سے وہ کتاب نکالی اور سامنے رکھ لی۔ تاکہ اب نہ بھولوں اور ضروری نوٹس لے کر اسے واپس کر دوں۔

میرا اپنا یہ حال ہے کہ کوئی مجھے کتاب پڑھنے کے لیے دے دے۔ مگر مجھ سے اس فراغ دلی کی اُمید نہ رکھے۔ کیونکہ ماضی میں کچھ ایسے تلخ تجربات ہوئے کہ اس کے بعد کتاب دینا چھوڑ دی۔ حال ہی میں ایک دوست نے لائبریری میں اخبار پڑھتے ہوئے مجھ سے ذکر کیا کہ میں نے فلاں فلاں اخبار میں ان دو کتابوں پر مختلف کالم نگاروں کی رائے پڑھی تو دل چاہا کہ یہ کتابیں خریدی جائیں۔ ان کا پبلشر کون ہے؟ میں نے پبلشر کا نام بتا دیا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ یہ دونوں کتابیں اسی پبلشر نے مجھے بھی تبصرے کے لیے بھیجی تھیں۔ میں نے رائے لکھ کر بھیج دی ہے۔ کیونکہ اگر بتا دیتا تو کتابیں دینا پڑتیں اور میں یہ رسک لینے کے لیے تیار نہ تھا۔

بعض لوگ آپ کی لائبریری کا جائزہ لیتے ہوئے کتاب پسند کر لیتے ہیں اور پھر کتاب

رانا محمد شاہد

لینے کے لیے اپنے تعلق کا سہارا لیتے ہیں۔ آپ باوجود کوشش کے مجبور ہو جاتے ہیں اور پھر وہ کتاب آپ کو کبھی واپس نہیں ملتی۔ ایسے مہمان یا دوست بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ مجبوری میں دی گئی کتاب کا دکھ اس وقت شدید تر ہو جاتا ہے۔ جب اچانک آپ کو اس کتاب کی ضرورت پڑتی ہے اور باوجود تلاش کے نہیں ملتی۔ فیض احمد فیض کی اہلیہ ایلس فیض اسی حوالے سے ایک جگہ لکھتی ہیں۔ ''چند برس پہلے تک میری چھوٹی سی لائبریری (کتب خانے) میں ایک کتاب تھی، جس کا نام تھا "The smallest room" یہ کتاب ہر گھر کے اُس خاص کمرے کے بارے میں تھی جو سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کتاب میں چھوٹے ترین کمروں کی تاریخ بیان کی گئی تھی اور اس کتاب کو پڑھ کر ہی پتہ چلا کہ زمانوں پہلے سب سے چھوٹا کمرہ ایک پاگل خانے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ بات عجیب ضرور ہے مگر اچھی ہے کہ جن کا توازن صحیح نہیں تھا، انھوں نے چھوٹے ترین کمرے کی اہمیت کے بارے میں سوچا اور جانا۔ ہو سکتا ہے ان کو علیحدہ کمرے میں رہنا اچھا لگا ہو بہ نسبت ایک ہجوم کی صورت ساتھ رہنے کے! کتنی مرتبہ شدت سے دل چاہا کہ اس کتاب کو ایک بار پھر پڑھوں، لیکن کوئی پڑھنے کے لیے لے گیا تھا۔ کیا میں یہ کتاب چند دنوں کے لیے لے جاؤں؟ اور پھر کبھی واپس نہیں آئی۔ مجھے اس کتاب چور کا نام معلوم ہے۔ اب ہم سے بہت دور رہتے ہیں مگر یہ نہیں معلوم کہ The smallest room ان کے پاس موجود بھی ہے یا کھو چکے۔ وہ مہمان بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں۔ جو آپ کے گھر میں رکھی کتابوں کی الماریوں کا جائزہ لیتے ہیں اور پھر اچانک ایک کتاب پر انگلی رکھ کر کہتے ہیں ''اوہ واؤ، کیا میں یہ کتاب چند دنوں کے لیے لے لوں؟ پڑھ کر فوراً واپس کر دوں گا۔'' اس طرح'' میری چند بہت ہی نایاب کتابیں غائب ہو گئیں۔''

یہ بھی ضروری نہیں کہ جس کے پاس چند کتابیں ہوں یا جو کبھی کبھی مطالعہ کرتا ہو۔ وہ ہی کتاب پر قبضہ کرنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔ یہاں جن کی بڑی لائبریریز ہوں یا جو وسیع المطالعہ شخص ہو، وہ کتاب پر زیادہ اچھے طریقے سے ہاتھ صاف کرتا ہے۔

عموماً ایسے بھی ہوتا ہے کہ کتاب لے کر جانے والا کچھ دنوں کے بعد جب یہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اس نے کتاب واپس نہیں کرنی تو پھر پڑھنے کی نوبت نہیں آتی اور آئے گی بھی کیوں جب یقین ہے کہ یہ کتاب اس کے ہمیشہ پاس رہے گی تو جب دل کرے گا پڑھ لوں گا اور پھر دل کبھی نہیں کرتا۔ ایسا ہوتا ہے کہ آپ کتاب واپس کرنے کا ارادہ کرتے ہیں تو کتاب بھی پڑھی جاتی ہے۔ بعض لوگ مفت میں ملی کتاب کے ساتھ وہ سلوک کرتے ہیں کہ بندہ ساری زندگی یاد رکھتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جارج برنارڈ شا نے کسی دوست کو اپنی نئی آنے والی کتاب تحفے میں دی۔ اور کتاب کے پہلے صفحہ پر لکھ دیا ''برنارڈ شا کی طرف سے''۔ کچھ عرصے کے بعد برنارڈ شا کا ایک پرانی کتابوں کی دکان سے گزر ہوا تو وہاں کتابوں کی ورق گردانی کے دوران اسے اپنی وہی کتاب نظر آ گئی، جو اس نے اپنے دوست کو تحفہ میں دی تھی۔ ان نے دکان سے وہ کتاب خریدی اور اسی دوست کے ایڈریس پر اس جملے کے اضافے کے ساتھ بھیج دی کہ ''ایک بار پھر برنارڈ شاہ کی طرف سے''۔ ویسے یہ ہمت جارج برنارڈ شاہ جیسا شخص ہی کر سکتا تھا۔

ہمارے ہاں جیسے مفت میں ملی دوسری اشیا کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ ایسا ہی سلوک کتاب کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ مفت میں ملی کتاب کو کوئی پڑھتا نہیں اور خریدنے پر تیار نہیں ہوتا۔ ایک دوست سے کہا کہ میری کتاب آ رہی ہے، ایک نسخہ خرید لو۔ پوچھا کتنے کی ہے۔ میں نے کہا 600 کی ہے۔ تم 500 دے دینا تو بولا میں اس کی پانچ کلو چینی نہ لوں۔ جبکہ مجھے یقین تھا کہ اگر مفت میں بھی دوں تو وہ ویسی ہی پڑی رہے گی۔ اس لیے کوشش کرتا ہوں کہ مفت میں کتاب اُسے ہی جائے جو مطالعہ کا شوق رکھتا ہو۔ اور کم از کم اسے پڑھے تو سہی۔

دوستوں یا تعلق والوں کو کتاب نہ دینے کی وجوہات میں سے ایک یہ تھی کہ انہیں کتاب پڑھنے کا سلیقہ چھو کر بھی نہیں گزرا۔ کتاب کا عاشق یہ بات اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ کس احتیاط اور نفاست سے مطالعہ کرتا ہے اور کسی جگہ کوئی سلوٹ، داغ، دھبہ آپ کو نظر نہیں آئے گا۔ کوئی دوسرا دیکھ کر اندازہ نہیں لگا سکتا کہ کتاب کو لائبریری کا حصہ بنے 5 سال ہوئے ہیں یا ابھی پریس سے نکلی ہے۔ یعنی کتاب کی خوبصورتی اس کے پہلے دن کی طرح قائم ہے، مگر کچھ لوگوں کو آپ کتاب پڑھنے کے لیے دیں اور اگر وہ کچھ عرصے کے بعد واپس کر دیں تو دل میں ایک لمحے کے لیے یہ خیال ضرور آئے گا کہ کاش ہمیں یہ کتاب نہ ملتی یا ہم اسے بھول ہی گئے ہوتے۔ کتاب کے صفحات جگہ جگہ سے تڑے مڑے کٹے، پھٹے، جیسے کچھ دیر کے لیے بچے کا دل بہلانے کے لیے دے دی گئی ہو۔ کچھ صفحات پر پن یا پنسل سے جگہ جگہ نشان لگے ہوئے، کچھ کا دھاگہ باہر آیا ہو..... ایسی حالت میں ملنے والی کتاب کے بعد دوبارہ کون ہمت کرے گا کتاب دینے کی۔ میں نے بورے والہ کی پبلک لائبریری میں کتابوں کے حالات دیکھے ہیں۔ ممبرز کی کتاب ایشو کروانے کے 6,6 ماہ تک واپس نہیں کرتے اور جب واپس آتی ہے تو اس کے ابتدائی صفحات پر نقش نگار بنے ہوتے ہیں یا پہلے صفحہ، 100 ویں صفحہ یا 200 ویں صفحہ پر موبائل نمبر لکھا نظر آتا ہے کہ جیسے پڑھنے والوں کو دنیا میں صرف ان کے نمبر کی تلاش تھی۔ کہیں کہیں اپنے دانشورانہ جملے بھی لکھے نظر آتے ہیں۔ گویا کہہ رہے ہوں کتاب

سے زیادہ ان جملوں پر غور فرمائیں۔ جو لوگ کتابوں کے اصل عاشق ہیں۔ وہ ہر ماہ اپنی تنخواہ کا ایک معقول حصہ اپنے عشق پر لگا دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا کہنا ہے کہ جو بندہ اپنے شوق پر پیسہ نہیں لگا سکتا اور کسی سے کتاب مانگنے یا ہتھیانے کے انتظار میں رہتا ہے۔ اسے کتاب سے تعلق رکھنے کا کوئی حق نہیں۔ بعض لوگ کتاب کو ڈیکوریشن پیس سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ وہ بہت خوبصورت کتاب خریدتے ہیں۔ مگر پڑھنے کی نوبت نہیں آتی۔ مجھے ایک رائٹر دوست نے کہا کہ آپ کتاب مجھے بھیج دیں، پڑھ کر تبصرہ کر دوں گا۔ اسے کتاب بھجوائی۔ کچھ عرصے کے بعد سے ایک، دو دفعہ یاد کروایا، مگر کوئی جواب نہیں آیا اصرار کیا تو کہا کہ مصروف بہت ہوں، فری ہو کر تبصرہ لکھتا ہوں۔ آپ کی کتاب کے صفحات بہت زیادہ ہیں۔ پڑھنے کے لیے بھی وقت چاہیے اور یہ کہ پڑھوں گا تو تبصرہ کروں گا نا۔ کتاب بھیجنے کے بعد ایسے رویے تکلیف دیتے ہیں۔

یہ انسانی نفسیات ہے کہ جو شخص کتاب لے کر جا رہا ہے اور اس کی واپس کرنے کی بھی نیت ہو، وہ اسے پڑھے گا۔ فیض کہتے تھے۔ ''جو کتاب ادھار مانگ کر لے جا رہا ہے۔ وہ اسے پڑھے گا بھی۔'' مگر جسے آپ کتاب مفت میں دے دیں۔ اس کے لیے کتاب کی اہمیت اس کے پاس جاتے ہی ختم ہو جائے گی۔ ہاں یہ آپ کی ہمت ہے کہ آپ اس سے کتاب پڑھوا لیں۔ ایک لکھاری جب اپنی کتاب کے لیے رائے مانگ رہا ہوتا ہے تو اس کے پیش نظر یہی ہوتا ہے کہ میری کتاب پڑھی جائے۔ ایلس فیض اپنی ایک تحریر میں لکھتی ہیں۔

"Cry the Beloved Country" یہ کتاب گئی تو پھر کبھی واپس نہ آئی کہ اپنی خالی جگہ پر دوبارہ رکھی جا سکے۔ میری شدت سے خواہش تھی کہ کتاب واپس مل جائے۔ کتنے دن تک ترستی رہی، مگر میں ہمیشہ کی ڈرپوک اور بزدل، ان سے کتاب مانگنے کی جرأت نہ کر سکی۔ مجھے معلوم ہے وہ کتاب کون لے گیا ہے۔ کتاب کی نئی مالکن لاہور میں ہی رہتی ہیں۔ اور میں اپنے روپے کے آخری نوٹ تک (کیونکہ میرے پاس ڈالر نہیں ہیں) یہ شرط لگانے کو تیار ہوں کہ اس نے کبھی یہ کتاب پڑھی بھی نہیں ہوگی۔''

میں نے یہ ایرانی کہاوت کہیں پڑھی تھی کہ ''جو کسی کو کتاب پڑھنے کے لیے دے اس کا ایک ہاتھ کاٹ دو اور جو کتاب پڑھ کر واپس کر دے، اُس کے دونوں ہاتھ کاٹ دو۔''

یہ کہاوت پڑھتے ہوئے مجھے معروف ادیب اے حمید یاد آئے۔ وہ اپنے دوست اعجاز بٹالوی کے حوالے سے دلچسپ واقعہ بیان کرتے ہیں۔

''قیام پاکستان سے پہلے نسبت روڈ پر دیال سنگھ کالج لائبریری کے سامنے ساگر ہوٹل کے ایک کمرے میں ایک ہفت روزہ رسالے کا دفتر تھا۔ اس رسالے کا ایڈیٹر کوئی ہندو لڑکا تھا۔ میں اپنے دوست رام پال کے ساتھ یہاں آتا

تھا۔ کیونکہ رام پال سے پہلی ملاقات ریلوے کی گراؤنڈ میں ہوئی تھی۔ میں دفتر کے گھٹن زدہ ماحول سے گھبرا کر باہر گھاس پر بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا کہ رام پال وہاں آ گیا۔ یوں ہماری دوستی ہو گئی۔ اس وقت رام پال کے ہاتھ میں کوئی موٹی سی کتاب تھی۔ میں نے پوچھا کہ یہ کون سی کتاب ہے؟ تو اس نے سگریٹ کا لمبا سا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''روماں رولاں کی یاں کرستوف ہے۔'' فرانسیسی سے انگریزی میں ترجمہ ہوا ہے، بڑے کمال کی کتاب ہے۔'' اس زمانے میں انگریزی اتنی آسانی اور روانی سے نہیں پڑھ سکتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد یہ ضخیم کتاب شروع سے آخر تک پڑھی اور بار بار پڑھی۔ روماں رولاں سے بھی متعارف ہوا۔ اس میں شک نہیں کہ یہ خوشبودار اور دل گداز کتاب تھی۔ یہ کتاب مجھے عجیب اتفاق سے مل گئی تھی اور اس کے لیے میں اعجاز بٹالوی کا آج بھی شکر گزار ہوں۔ جبکہ اسے مجھ سے آج بھی شکایت ہے کہ میں نے اس کی کتاب اسے واپس نہیں کی۔ میں اس کتاب کی تلاش میں تھا، کہیں سے نہیں مل رہی تھی۔ پنجاب پبلک لائبریری میں یہ کتاب موجود تھی اور وہیں میں نے اسے بیٹھ کر جستہ جستہ پڑھا تھا۔ میں نے لائبریری سے اس کتاب کو چرانے کے واسطے بڑے منصوبے بنائے، مگر میں اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ اتفاق سے ایک روز میں اعجاز بٹالوی کے ٹرنر روڈ والے دفتر میں بیٹھا تھا کہ اس نے دراز میں سے ایک موٹی کتاب نکال کر میری طرف بڑھائی اور کہا۔ ''یہ کتاب پڑھی ہے تم نے؟''

میں نے کتاب کو دیکھا تو بڑا خوش ہوا۔ کیونکہ یہ وہی کتاب تھی جس کی مجھے ایک مدت سے تلاش تھی۔ یعنی ''یاں کرستوف''..... میں نے اعجاز سے کہا۔ ''یہ مجھے پڑھنے کے لیے دے دو۔''

میں نے اسی وقت دل میں فیصلہ کر لیا تھا کہ اعجاز بٹالوی چاہے مجھ پر مقدمہ دائر کر دے۔ میں اب اُسے یہ کتاب واپس نہیں کروں گا۔ اس کتاب پر اعجاز بٹالوی کے بڑے بھائی اور نامور افسانہ نویس تحریکِ پاکستان کے کارکن اور دانشور عاشق حسین بٹالوی کے دستخط موجود تھے۔ اعجاز بٹالوی بڑا یاروں کا یار ہے اور بڑا پیارا انسان ہے۔ کہنے لگا۔ ''اے حمید کتاب لے جاؤ مگر پیارے ایک بات ہے، پڑھ کر یہ واپس ضرور کر دینا۔ کیونکہ یہ کتاب میرے بڑے بھائی کی میرے پاس امانت ہے۔''

''کیوں نہیں واپس کروں گا۔ پڑھنے کے فوراً بعد تمھاری امانت تمھیں لوٹا دوں گا۔''

وہ کتاب آج بھی، اس وقت بھی میری کتابوں کے شیلف میں پڑی ہے اور میں اسے کبھی کبھی کھول کر جہاں سے دل چاہے پڑھ لیتا ہوں۔ اعجاز بٹالوی نے بعد میں کئی بار کتاب واپس مانگی۔ میں نے اسے صاف صاف کہہ دیا کہ اعجاز بٹالوی، یہ کتاب میں کبھی واپس نہیں کروں گا۔ چاہے تم کچھ بھی کر لو۔ اب اعجاز نے تقاضا کرنا بھی چھوڑ دیا ہے۔''

☆☆☆☆☆

جلیل عالی ایک منظّم راہنما

معزز حاضرین!

میں نے چند منٹ کی یہ تحریر اس لیے لکھی ہے کہ زبانی کلامی تحسین کرنے میں پورے پینتالیس منٹ کا پریڈ خرچ ہوتا ہے اور اپنے فاضل دوست پروفیسر ڈاکٹر عاجز ادیب کی طرح ادبی تنقید کی عمرانیات پھر جمالیات اور پھر ساختیات پھر مابعدالاساختیات کا فلسفہ حیات بیان کرتے کرتے عمریں بیت جاتی ہیں، مگر فلسفہ حیات سمجھ نہیں آتا۔ میرے ذاتی خیال میں تمام فلسفوں سے زیادہ اہم بات تخلیق اور تخلیقی سوچ ہے۔ یہ ہی نکتہ آپ کو مدبر اور معتبر بناتا ہے۔

کوئی بھی شخص اپنے بدن پر لحاف یا کمبل لپیٹ کر کلاسیکل ڈانس نہیں کرسکتا، بالکل اسی طرح کوئی بھی شاعر جب تک فرسودہ روایات اور خود اپنی امامت میں ادائیگی نماز ترک نہیں کرتا، تعصب اور اقدار کی پامالی جیسی عادت بد سے نہیں نکلتا، اس وقت تک وہ اچھی شاعری نہیں کرسکتا۔

اچھی شاعری کیا ہے؟ سوال اپنی جگہ موجود ہے اور موجود رہے گا کہ انسانی ذہنی ترقی کا سفر جاری ہے اور جاری رہے گا، آگے کی بات کرنا، پچھلی بات کو چھوڑنا یا جوڑنا، یہ کام بھی جاری رہے گا، مگر اچھی نظم کیا ہے، اس سوال کو سمجھنے کے لیے اگر ہم اچھی نظم کا ایک کلیہ بنالیں اور کہیں کہ اچھی نظم کا مضمون بین الاقوامی، زبان مقامی، اور لہجہ رواں دواں ہوتا ہے۔ اچھی نظم میں ایک بات ہوتی ہے، جو سمجھ میں آتی ہے اور اپنا آپ سمجھاتی ہے اس کے ساتھ ساتھ یہ ہذیان نویسی اور جگہ جگہ بیان حلفی دینے سے بھی یکسر پاک ہوتی ہے یعنی بے مقصد ہوتی ہے نا ہی نعرے بازی کو چھوتی ہے۔

مجھے اپنے اس بیان تک پہنچنے میں ایک طویل عرصہ لگا، نظم لکھنے سے پہلے پڑھنے کا

اعجاز رضوی

عمل شروع ہوا۔

ن۔م راشد، مجید امجد، اختر حسین جعفری اور خالد احمد کی نظموں کو پڑھا پھر اختر حسین جعفری کی نظموں نے نظم کو سمجھنے کا گر سکھایا، اور خالد احمد کی نظموں نے خود کو پیش کیا کہ اُن کو پڑھنے لکھنے اور سمجھنے کے لیے ماڈل بنایا جائے شاید یہ ہی وجہ ہے کہ میں غزلیات میں بھی نظم تلاش کرتا ہوں اور کچھ غزلوں کو نظم سمجھ کر ہی پڑھنے کی ابتدا کرتا ہوں میری اسی عادت نے بحیثیت نظم نگار جلیل عالی صاحب سے متعارف کروایا، 1998 کی ایک شام ''فنون'' کے دفتر میں عالی بھائی نے مجھے اپنا مجموعہ کلام شوق ستارہ، عطا کیا، تو میں حیران رہ گیا اور سمجھ گیا کہ خالد احمد صاحب کی قربت نے یہ اعزاز عطا کیا ہے کہ خالد احمد سے بحث کرنے والے ہر وقت مکالمہ کرنے والے جلیل عالی جیسے شاعر احمد ندیم قاسمی کے قریبی دوست، اور ایک دانشور نے برادر عزیز اعجاز رضوی، لکھ کر شوق ستارہ عطا کی ہے۔

سو میں نے اس مجموعہ کلام جو یقیناً اعلیٰ غزلیات کا مجموعہ ہے اس میں سے نظمیں تلاش کیں شوق ستارہ کی پہلی نظم تھی،

''زاویہ'' جو کچھ یوں تھی

ہے منظر وہی

پر

جہاں سے اُسے میں نے دیکھا ہے

تم بھی وہاں پر کھڑے ہو کے دیکھو

تو کچھ ایسے اسرار کھلنے لگیں گے

کہ شاید تمھیں

سارے منظر کے بارے میں

پہلا تاثر بدلنا پڑے

.....

اسی شوق ستارہ کی ایک اور نظم تھی ''پھول تمنا کا ویران سفر''

میری بلوری

شفاف محبت کا نمک

کس حقارت سے زمیں پر وہ گرا دیتا ہے

اور میں

درد کی پلکوں سے اُسے چن چن کر

بار بار اس کے تعلق کی خنک میز پر لے آتا ہوں

اس توقع پہ کہ شاید

کسی شاداب سے لمحے کی نمو کاری سے

اس کے احساس کی شاخوں پہ

جذبات شگوفے پھوٹیں

.....

ان نظموں کے علاوہ کاش، حاصل، پہلی سے پہلے، پسند کا محاذ اور سائبان جیسی بہت سی نظمیں اُن کو نظم کا شاعر کہلوانے کے لیے کافی ہیں اس کے بعد عرض ہنر سے آگے۔ اور اس سے بھی پہلے خواب در بچہ نے جلیل عالی کو ایک ممتاز حساس دانشور شاعر ادیب کے روپ میں قارئین کی نذر کر دیا تھا۔ اب جو مجموعہ نظم قلبیہ کے نام سے مجھے ملا ہے یہ یقیناً زمانی ترتیب کے حساب سے 38

سال کا تسلسل ہے۔ کسی شاعر کو سمجھنے کے لیے اس کی کسی ایک نظم یا غزل کو مثال بنانا اس کے قارئین اور ہم عصر شعرا کے ساتھ ناانصافی ہوتی ہے۔

کوئی بھی شاعر اپنی کسی ایک نظم یا غزل میں مجسم نہیں ہوتا اس کے ٹکڑے اس کی ہر تخلیق کے ہر ہر لفظ میں پوشیدہ ہوتے ہیں اسی لیے میں نے جلیل عالی کی پرانی نظموں کا حوالہ دے کر آپ کو مخاطب کیا۔

جلیل عالی کا تازہ مجموعہ نظم قلبیہ پڑھنے کے بعد مجھے ذاتی طور پر یہ حوصلہ ملا ہے کہ میں نظم کے جس یکطرفہ راستے پر گامزن ہوں وہ راستہ ن م راشد، مجید امجد، اختر حسین جعفری اور خالد احمد کے بعد اب جلیل عالی کے نام سے پہچانا جائے گا۔

اور یقینی طور پر پہچان اور راہنمائی کا فریضہ وہی شاعر ادا سکتا ہے، جس میں یہ جرأت ہو کہ وہ نظم کا مجموعہ سامنے لائے، محض غزلیات کے قدیمی صندوق سے چند نظموں کی رونمائی کرنا، اور اعلان کرنا کہ میں عوامی سماجی اور زمینی حقائق سے آشنا ہوں اور اس کی ہی بات کر رہا ہوں۔ محض دعویٰ ہے

جلیل عالی کی نظموں کی بات ہو یا مکمل جہاں شاعری کی مکمل غزلیات زیر بحث ہوں یا ایک مصرعہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم کسی غیر ملکی غیر مشرقی غیر اُردو اور بالکل غیر تنقید نگار کا حوالہ دیں، تو سنیے،

میتھیو آرنلڈ کہتا ہے کہ شاعری تنقید حیات ہے۔

زندگی کو معروضی اور غیر ذاتی زاویہ نگاہ سے دیکھنے اور اعلیٰ ترین اقدار اور خیالات کی تلاش کرنا ہی اعلیٰ شاعری ہے سو آرنلڈ کی رائے کو ہم مثال بناتے ہوئے اور اپنے بڑے دانشوروں، احمد ندیم قاسمی، فتح محمد ملک، حمید شاہد، خورشید رضوی، خواجہ زکریا، آفتاب اقبال شمیم، ڈاکٹر غافر شہزاد اور دیگر تنقید نگاروں کی کسی بھی فن پارے پر کی گئی تنقید کو رائے کو مقامی رائے سمجھتے ہوئے کہہ سکتے کہ جلیل علی نے آرنلڈ کی اس تعریف کو سامنے رکھتے ہوئے نظمیں تخلیق کی ہیں۔

جلیل عالی کی نظم قلبیہ ایک طویل نظم ہے۔ اس میں موت کے چنگل میں پھنسے زندگی کی طرف بھاگتے ہوئے شخص کی پوری کہانی پوشیدہ ہے۔

نظم میں کہیں کہیں بھاری بھرکم مصرعوں کو سہارا دینے کے لیے کنکر پتھر بھی نظر آتے ہیں مگر اصل نظمی عمارت اپنے پورے جاہ و جلال کے ساتھ قاری کے قلب پر اثر انداز ہوتی ہے مگر یہ اثر اندازی اسی قاری کے لیے ہے جو نظم کی خاندگی میں ماہر ہو، غزل کی طرح نظمی مصرعے کی قرأت نہ کرے جلیل عالی کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ مصرعوں کو سمجھا جائے۔

اور ٹھہر ٹھہر کر، واہ واہ کیے بغیر مسلسل پڑھ جائے۔ اور غور کیا جائے۔ وہ کہتے ہیں:

مجھے یہ آئنے سے کون تکتا ہے

مرے جیسی شباہت ہے
مگر یہ میں نہیں ہوں
اور ہے کوئی،

.....

لہو میں رقص کرتی حیرتیں
چہروں پہ کب تصویر ہوتی ہے
مرے سینے کے بکسے میں نہیں
آنکھوں میں میرا دل دھڑکتا ہے
میں آوازوں کا سیرت آشنا ہوں
جان لیتا ہوں
کسی لب سے ادا ہوتے سخن
دراصل کن معنوں کا پردہ ہے

.....

قلبیہ ایک طویل نظم ہے جس میں ایک مسلسل طول پکڑتی کیفیت نظر آتی ہے، جو قاری کو نا صرف اپنی گرفت میں رکھتی ہے بلکہ اُسے یہ بھی یاد دلاتی ہے کہ وہ بھی اس راستے سے گزارہ ہے یا خدانخواستہ گزرے گا، تو اس کی کیا کیفیت ہوگی اس کے علاوہ قلبیہ میں موجود نظمیں دن بدلتے نہیں معلا الٹ بچھ گیا، تھونائی، دل زادہ، آواز کا قاتل، جیسی بہت سی نظمیں پڑھتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ جلیل عالی صرف شاعر ہی نہیں ایک حساس شاعر ہیں اور جدید دنیا کے مزاج آشنا بھی ہیں، انھیں اس بات کا کوئی خوف نہیں ہے کہ لوگ کیا کہیں گے۔

جلیل عالی کے گزشتہ شعری اثاثے سے آشنا ہر قاری کو یہ اندازہ ہے کہ جلیل عالی کوئی معمولی شاعر نہیں ہے۔ نہ ہی یہ فیشن کے طور پر لکھنے لکھانے سے وابستہ ہیں نا ہی یہ لفظوں کی بادلی بیڈیا پکانے کے شوقین ہیں۔ ہاں یہ تجربہ ضرور کرتے ہیں اور وہ بھی روزانہ کی بنیاد پر۔ اگر 1988 میں یہ لفظ لکیرے، تنویرے، زنجیرے، تحریرے لکھ سکتے ہیں تو پھر اس کو آگے بھی بڑھا سکتے ہیں اور بڑھا رہے ہیں، ان کی تازہ شاعری اس بات کی گواہ ہے کہ یہ لفظوں کی قدیمی ساخت کو جدت سے آشنا کر رہے ہیں۔

جلیل عالی! کا سفر اوبی گلوبل کا سفر ہے جس میں کسی ایک سمت کا تفصیلی احوال نہیں بلکہ ہر اس طرف کا سفر ہے جہاں سے گلوبل اپنی فطری رفتار کے ساتھ گزرتا ہے اور منطقی اور مقررہ مقام پر ٹھہرتا ہے۔ جلیل عالی کے مجموعہ کلام قلبیہ کو پڑھتے ہوئے جو محسوس ہوتا ہے اس کیفیت کو خود جلیل عالی صاحب کی زبانی سن لیجیے:

نقطہ، لفظ لڑیوں کا قصہ کہاں ہے
یہ اک ایسی موجِ شعور و گماں ہے
کہ چھونے سے جس کے یہ محسوس ہوتا ہے
اندر کی خاموشیوں میں کہیں،
خود کلامی کی اک آب جوی رواں ہے
خدا کرے، یہ آب جو رواں رہے اور ہم فخر سے کہہ سکیں کہ ہم جس آب جو سے متصل قریہ سبزہ میں بیٹھے ہیں وہ قریہ سبز، جلیل عالی ہے۔

☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے نلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اورگورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داشان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

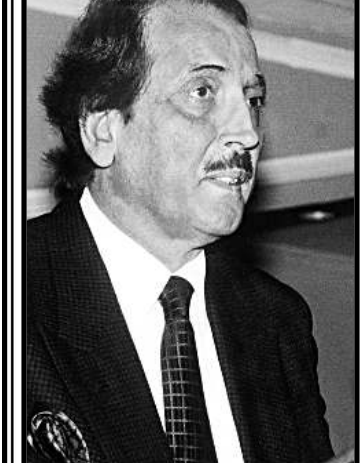

شوکت علی شاہ

چائے کی دعوت تو دے بیٹھے تھے ایک نئی اُفتاد آن پڑی۔ باقی لوگوں کو تو عام چائے پلائی جا سکتی تھی لیکن شاہی پارٹی کے لئے فائیو سٹار ہوٹل کے بیرے، کراکری، کٹلری اور بیکری لازمی تھی۔ ہم ایک بار پھر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ سب فائیو سٹار ہوٹل لاہور سے کم فاصلے پر نہ تھے۔ جب ہم نے ہلٹن ہوٹل کی انتظامیہ سے رجوع کیا تو انہوں نے ترت انکار کر دیا۔ چار سو میل کے فاصلے پر چار سو آدمیوں کے لئے صرف چائے کا انتظام کرنا بڑا غیر منافع بخش کاروبار تھا۔ پہلے تو ہم منت سماجت کرتے رہے لیکن جب وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے تو میں نے آخری انتظامی حربہ استعمال کیا۔ انکار کی صورت میں تم لوگ یہ ہوٹل

چلا نہیں پاؤ گے۔ ”وہ کیسے؟“ جنرل منیجر نے حیرانی سے پوچھا۔

”اگر تمہارا باورچی خانہ چیک کیا جائے تو آج اسی وقت پیورفوڈ ایکٹ میں چالان ہو سکتا ہے۔ ذرا سوچو۔ جب یہ خبر اخباروں میں چھپے گی تو کون آئے گا یہاں؟“

”یہ تو صریحاً دھونس، دھاندلی اور بلیک میلنگ ہوئی“۔ اس نے احتجاج کیا۔

”میں دوہرے معیار کو پسند نہیں کرتا۔ ابھی پچھلے ہفتے تم نے وزیراعظم کے لئے ڈیرہ غازی خان میں لنچ کا انتظام کیا ہے۔“ اسے میری معلومات پر حیرت تو ہوئی لیکن راضی ہو گیا۔ یہ طے پایا کہ ان کے عملے کے بارہ آدمیوں کو جہاز کا ٹکٹ دیا جائے گا۔ پانچ سو روپے فی کس چارجز ہوں گے۔ علاوہ ازیں دو ریفریجریشن وین مہیا کی جائیں گی۔ انہیں کیا علم تھا کہ کس مشکل اور منت سماجت سے ہم نے اپنے لاڈلے وزیر اعلیٰ کی ”باباجی“ سے ملاقات کا اہتمام کیا تھا۔ پروگرام کے تحت میاں صاحب کو بذریعہ ٹرین لاہور سے رحیم یار خان آنا تھا۔ میاں صاحب نے بڑے عجیب شوق پال رکھے تھے۔ انہیں صحرا میں راتیں گزارنے کا شوق تھا۔ اس سلسلے میں رینجرز کے ایک لیفٹیننٹ کرنل جاوید شاہ سے دوستی گانٹھ رکھی تھی۔ پہاڑ پر رہنے کا خبط تھا پنڈی مری سڑک مہینوں میں ڈبل کرا دی۔ وزیراعلیٰ بننے سے پہلے کشتی کا شوق تھا گدر بھی پھیر لیتے تھے۔ کشتی کے لئے انہوں نے باقاعدہ ایک پہلوان رکھا ہوا تھا جو ہر کشتی میں چاروں شانے چت گر جاتا۔ کرکٹ کے رسیا تھے۔ چوکوں پر چوکے مارتے اور کبھی آؤٹ نہ ہوتے۔ ہو بھی نہیں سکتے تھے کیونکہ امپائرنگ ”بین الاقوامی“ لیول کا ایک شخص کرتا تھا۔ جس کا نام پرویز مسعود تھا اور وہ اتفاق سے چیف سیکرٹری پنجاب تعینات تھا۔ ایک مرتبہ میاں صاحب بیٹنگ کر رہے تھے کہ کسی باؤلر نے باؤنسر پھینک دیا۔ جب وہ میدان سے باہر نکلا تو اسے ایک زناٹے دار تھپڑ پڑا۔ حرامی! اگر بال میاں صاحب کو لگ جاتا تو! ان کا گن مین چلایا۔

اسی طرح جب ریل میں سفر کرتے تو حواریوں، درباریوں، لطیفہ گوؤں کی پوری ٹیم ساتھ ہوتی۔ ان میں ایک تو داڑھی والا بابا تھا۔ اس کم بخت کو دنیا کا ہر غلیظ لطیفہ یاد تھا۔ سنانے کا انداز بھی منفرد تھا۔ وہ میاں صاحب کو ہنسا ہنسا کر دوہرا کر دیتا۔ دوسرے سجاد شاہ صاحب تھے۔ ان کے لطیفے قدرے کم غیر مہذب ہوتے۔ جب میاں صاحب کا کم ہنسنے کا موڈ ہوتا تو یہ اپنے ہنر کے مجرے دکھاتے۔ تیسرے زمان پارک کے شکاری تہور علی خان تھے۔ یہ از خود لطیفہ تھے۔ میاں صاحب کو انہیں چھیڑ کر بڑا مزہ آتا۔ بڑی سنجیدگی سے پوچھتے ”ہاں تو خان صاحب! آپ نے ہوگرالی کے جنگل میں وہ آدم خور کس طرح مارا تھا؟“ جب تہور علی خان اپنی شکاریات کی پٹاری کھولتے تو پتہ چلتا کہ اس دن سوائے خان صاحب اور اُن کی دونالی بندوق کے کچھ بھی باقی نہ بچا تھا۔ ایک سدا بہار خالد محمود صاحب بھی

تھے۔ ان کا کام محض ہنکارا بھرنا اور جی حضوری کرنا تھا۔ جب میاں صاحب ہنستے تو یہ بھی ہنس دیتے۔ اگر میاں صاحب دن کو رات کہتے تو یہ فٹ بولتے۔ سرکار مجھے تو اس گھپ اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔

میں نے ایک تجربہ کار ڈپٹی کمشنر سے میاں صاحب کے ناشتے کا پوچھا تو سرزنش کرتے ہوئے بولا "عجیب ڈپٹی کمشنر ہو۔ اس قدر اہم کام سے ابھی تک بے خبر ہو۔" میں نے اپنی کم علمی پر معذرت کی اور اپنے سوال کو دہرایا تو بولے "جہاز سے آ رہے ہیں یا ٹرین سے؟" جب انھیں بتایا کہ میاں صاحب کا سیلون علی الصبح رحیم یار خان پہنچے گا تو کہنے لگے "پھر ابھی سے کمر کس لو۔ ایک بنیادی بات تو یہ ہے کہ ہر چیز دیسی گھی میں پکنی چاہیے۔ حلوہ پوری، چنے، مچھلی کم از کم تین قسم کی۔ نہاری، سری پائے، لسی، میٹھی اور نمکین دونوں قسم کی۔ مرغ مسلم اور وہ بھی مسلمان ہو۔"

عرض کیا "میں کچھ سمجھا نہیں۔"

بولے "میری مراد دیسی مرغ سے ہے۔ فرنچ ٹوسٹ، انڈے، فرائی، آملیٹ اور اُبلے ہوئے انڈے۔ پراٹھے جن سے گھی ٹپک رہا ہو۔ مٹن چانپ اور بھنا ہوا تیتر اگر دستیاب ہو۔ باقی رہے مکھن ٹوسٹ چائے تو وہ ہر ناشتے میں ہوتے ہی ہیں۔"

"اس کے علاوہ کچھ اور؟" منشی محمود کی طرح ڈانٹتے ہوئے۔ بولے "کچھ اپنا بھیجا بھی استعمال کرو۔ کیا اس جہان میں کھانے پینے کی صرف یہی چیزیں رہ گئی ہیں۔"

حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنا بھیجا استعمال کرنے کی نوبت نہ آئی۔ وہ پہلے ہی اپنی جگہ سے کھسک چکا تھا۔

جب میاں صاحب شاہانہ ناشتہ کر کے سیلون سے باہر نکلے تو اُن کا والہانہ استقبال ہوا۔ سارا شہر اُمڈ آیا تھا۔ علامہ نے درست ہی کہا تھا۔ دیر و حرم کی قید کیا جس کو وہ بے نیاز دے۔ اس وقت تک میاں صاحب فنِ تقریر سے نابلد تھے۔ بولتے ہوئے شرما جاتے۔ لفظ ٹوٹ پھوٹ کر ان کے دہن سے نکلتے۔ کارخانہ دار تھے۔ عام لوگ ان سے خدا واسطے کا بیر رکھتے ہیں۔ بایں ہمہ یہ پنجاب کی حد تک بڑے مقبول لیڈر تھے۔ سرخ سفید رنگ، گٹھا ہوا مضبوط جسم، چوڑے چکلے ہاتھ، چہرے پر ایک معصومانہ سی مسکراہٹ۔ سیاست میں بچہ پاس ہو گیا تھا۔ ان کے متعلق مشہور ہو گیا تھا کہ میاں نواز شریف بہترین دوست اور بدترین دشمن ہیں۔ پنجاب میں یہ بہت بڑی خوبی سمجھی جاتی ہے۔

ہمیں محل تک پہنچتے پہنچتے دو گھنٹے لگ گئے۔ شیخ زید نے پورچ میں آ کر ان کا استقبال کیا۔ دونوں گلے ملے اور ایک دوسرے کے گالوں پر روایتی بوسے دیے۔ لنچ سے پہلے دو گھنٹوں تک انہوں نے تنہائی میں بات چیت کی۔ لنچ شروع ہی ہوا تھا کہ ایک عجیب خبر آئی۔ ہزاروں آدمی ہاتھوں میں عرضیاں پکڑے شیخ زید کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ میونسپل کمیٹی کی دیوار پھلانگ کر اندر آنا چاہتے تھے کہ پولیس نے لاٹھی چارج کر دیا اور آنسو گیس استعمال کی جس کی بو چار سو پھیلی ہوئی تھی۔ ان حالات

میں شیخ زید کا وہاں جانا سیکورٹی رسک تھا۔ عین ممکن تھا کہ پروگرام کینسل ہو جاتا لیکن ظفر اقبال کی دوستی پھر کام آئی۔ بولا "شاہ صاحب! کچھ بھی ہو جائے میں میاں نواز شریف کو بابا جی کے ساتھ Drive in state ضرور کراؤں گا۔ میاں صاحب کا شوق اپنی جگہ لیکن میری اور ایس ایس پی کی جان نکلی جا رہی تھی۔ اگر خدانخواستہ معزز مہمان کو دھکا بھی لگ جاتا یا ذرا سی بھی گزند پہنچتی تو ایک بین الاقوامی سکینڈل بن سکتا تھا۔ وہ لمحات ہم نے کس طرح گزارے اس کا صرف ہمیں ہی علم تھا۔ چونکہ میں اس پروگرام کا معمار تھا اس لئے سارا ملبہ مجھ پر ہی پڑنا تھا۔ ہم نے سارے ضلع کی پولیس دیواروں کے ساتھ لگا دی۔ لاٹھی چارج کے بعد لوگ اندر تو نہ آئے لیکن انہوں نے بھی دیوار سے دُور ہٹنے سے انکار کر دیا۔ جب کیول کیڈ میونسپل کمیٹی پہنچا تو ساری فضا نعروں اور تالیوں سے گونج اُٹھی۔ میاں صاحب نے سوچا کہ شیخ زید پر اپنی مقبولیت ظاہر کرنے کا یہ نادر موقعہ ہے۔ میرے کان میں کہنے لگے "ان سب لوگوں کو اندر بلا لیں" مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں ہو رہا تھا۔

عرض کیا "سر! یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ ایک خروش ہو جائے گا۔ چائے کی پیالیاں اور بیکری ایٹم بٹنگ کی طرح اُڑنے لگیں گے۔ مدعوئین میں سے چائے چھوڑ کوئی پانی کا گلاس بھی نہیں پی سکے گا۔ پھر اس اژدہام نے رُکنا تھوڑی ہے۔ اپنی عرضیوں کے ساتھ وہ سٹیج پر یلغار کریں گے۔ اس کے بعد خدانخواستہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوگا۔ میرے پرستار ہیں انہیں میری تقریر سننے دیں۔" میاں صاحب اس بچے کی طرح مچل گئے جس کے ہاتھ میں جھنجھنا آ گیا ہو۔ Sir! I will not at all advise you. It is a scurity hazard. میرے لہجے کے وثوق اور تیقن کو دیکھ کر انہیں حیرانی ہوئی۔ غالباً ایک Go, Getter سے یہ توقع نہیں کر رہے تھے۔

"پھر کیا کیا جائے؟" انہوں نے بے بسی اور حسرت سے کندھے اُچکائے۔

"اچھا یہ کریں کہ یہ جو مدعوئین لان میں بکھرے پڑے ہیں انہیں قریب بلا لیں۔"

"یہ ممکن ہے ویسے آپ کی تقریر باہر بھی سنی جا سکے گی اور جوابی نعروں کی گونج آسانی سے اندر آ سکے گی۔" میں نے انہیں تسلی دی۔

شیخ زید اور میاں صاحب نے بڑی اچھی تقریریں کیں۔ اس سے پہلے تلاوت کلام پاک اور نعت خوانی ہوئی۔ میاں عبدالخالق نے سپاس نامہ پڑھا۔ سپاس نامہ میں ہز ہائی نس کی خدمات اور مہربانیوں کا اعتراف کیا گیا تھا اور یہ توقع ظاہر کی گئی کہ وہ اسی طرح کرم فرمائی کرتے رہیں گے۔ اس کے ساتھ ساتھ میاں نواز شریف کے کارناموں اور مقبولیت کا بھی ذکر کیا گیا۔ سپاس نامہ سن کر میاں صاحب کا موڈ قدرے ٹھیک ہوا۔ جب اپنی تقریر پر انہیں داد ملی تو بالکل نارمل ہو گئے۔ چونکہ ہمیں ہجوم کی

نفسیات کا اندازہ تھا اس لئے پلاننگ یہ کی کہ تقریر کے بعد بابا جی کو واپس کرسی پر بیٹھنے نہیں دینا۔ سٹیج کے ساتھ لگی کار میں بٹھا کر محل روانہ کر دینا ہے۔ اس کے لئے ہم نے پچاس کمانڈوز ڈیوٹی پر تعینات کیے۔

شیخ زید نے پندرہ منٹ تقریر کی۔ زندہ باد اور تالیوں کے شور سے شہر کے در و دیوار گونج اُٹھے۔ جو لوگ دیوار کے باہر کھڑے تھے وہ بھی پورے زور شور سے نعرے بازی کر رہے تھے۔ ہم نے عام شیڈول سے ہٹ کر چائے پہلے پلا دی تھی۔ پندرہ منٹ کی تقریر کے دوران شیخ زید نے ان منصوبوں کا ذکر نہ کیا جو مکمل ہو چکے تھے بلکہ ان منصوبوں کی خوشخبری سنائی جو شروع ہونے والے تھے۔ جب انہوں نے یہ کہا کہ میرے ہوتے ہوئے رحیم یار خان کا کوئی شخص بھوکا نہیں سوئے گا۔ کوئی طالب علم محض فیس نہ ہونے کی وجہ سے سکول سے نہیں نکالا جائے گا کوئی بیوہ کسمپرسی کی زندگی نہیں گزارے گی، کوئی شادی محض جہیز نہ ہونے کی وجہ سے نہیں رُکے گی تو مجمعے پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہوگئی۔

تقریر ختم ہوتے ہی تین سو سپاہیوں نے سیکورٹی رنگ بنا لئے۔ کمال تیزی، سرعت رفتار اور مہارت سے ہم نے معزز مہمان کو گاڑی میں بٹھایا۔ گاڑی چلی ہی تھی کہ ہزاروں لوگ سپاہیوں کو روندتے، اُن کے کندھوں سے پھلانگتے سٹیج پر چڑھ آئے۔ ان کے ہاتھ میں درخواستیں اور آنکھوں میں اُمید و بیم کی جھلک تھی۔ سٹیج ٹوٹ گئی لیکن اس وقت تک شاہی سواری نکل چکی تھی۔ اگر ایک لمحے کی بھی تاخیر ہو جاتی تو معزز مہمان کی ہڈی پسلی ٹوٹنے کا قوی امکان تھا۔

میاں صاحب بہت خوش واپس گئے۔ اگر وہ نہ بھی بولیں تو ان کے چہرے کے تاثرات اُن کے خیالات کی غمازی کرتے ہیں۔ انہوں نے نہ صرف شیخ زید سے تعلقات استوار کر لئے تھے بلکہ بے نظیر کے دیرینہ تعلقات کو بھی زک پہنچائی تھی۔ مرکزی حکومت کا یہ مطالبہ کہ ہز ہائی نس ایک صوبائی وزیر اعلیٰ کے ساتھ سوک ریسپشن پر نہ جائیں مسترد کر دیا گیا تھا۔ میاں صاحب نے ہز ہائی نس کو تحفے میں ایک مہار اُونٹ، دو راس بیل اور ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا پیش کیا۔ شیخ زید نے جو کچھ دیا اس کا علم صرف انہیں یا ظفر اقبال کو تھا۔

لاہور پہنچ کر انہوں نے حکم دیا کہ شاہی پارٹی کے لئے ڈرائی فروٹ اور تازہ پھل بھجوائے جائیں۔ ہم نے لکڑی کے خوبصورت بکسوں میں ۱۲ کلو کاجو، اتنے ہی بادام، پستہ اور چلغوزے، اخروٹ کشمش اور تازہ فروٹ بھجوایا۔ جب کراؤن پرنس شیخ خلیفہ اور سرور بن محمد آئے تو ان کو بھی میوہ جات اور تازہ پھل بھجوائے گئے۔ محمد خان جونیجو نے بھی شیخ زید کو ڈرائی فروٹ اور تازہ پھلوں کا تحفہ دیا۔ ہم نے بل بھجوائے۔ وزیر اعظم ہاؤس سے تو چیک آ گیا لیکن میاں صاحب نے ساٹھ ہزار روپے کا بل دینے میں تاخیر کی۔ میں نے کیٹرنگ سے بات کی تو بولا "میاں صاحب

نے کہا ہے کہ فی الحال ادائیگی نہ کرو۔"
میں نے ان سے بات کی تو بولے "اس قدر مہنگا فروٹ!"
عرض کیا "آپ نے ایک والئی ریاست اور شہزادگان کو تحفہ بھیجا ہے کسی گاموکلیانے کو دان نہیں دیا۔" اس پر وہ مسکرا پڑے اور کیئر ٹیکر نے ادائیگی کر دی۔

میاں صاحب ممبران اسمبلی کی نقل و حرکت پر کڑی نظر رکھتے تھے۔ مقابلہ مرکز کے ساتھ تھا، ذرا سے تساہل یا تغافل سے حکومت ہاتھ سے جا سکتی تھی۔ ضیا الحق کی اچانک موت نے ان پر ایک عجیب قسم کا خوف طاری کر دیا تھا۔ بے نظیر کی مقبولیت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا۔ جب جنرل جیلانی سے کسی نے پوچھا کہ ضیاء الحق کے بعد میاں صاحب کا کیا بنے گا؟ تو وہ ہنس کر بولے Bashira is trouble خوش قسمتی سے اسٹیبلشمنٹ بے نظیر کو مکمل اختیار دینے کے حق میں نہ تھی۔ اس کا مکمل طور پر راستہ روکا بھی نہ جا سکتا تھا۔ اس لئے پنجاب میں Old horse کو ایک بار پھر میدان میں لانے کا فیصلہ کیا گیا۔ بے نظیر بوجوہ فوج سے مخاصمت رکھتی تھی۔ وہ اپنے والد کی موت کو مکمل طور پر بھلا نہیں پائی تھی۔ پیپلز پارٹی کو اسی صورت میں لگام ڈالی جا سکتی تھی کہ پنجاب اس کے مخالف شخص کے حوالے کر دیا جائے۔ اس تناظر میں میاں صاحب نے پنجاب کی وزارت علیہ سنبھالی تھی۔ سیاسی چپقلش اور مخاصمت کا یہ عالم تھا کہ میاں صاحب اُس کے استقبال کے لئے ایئرپورٹ تک نہ جاتے۔ پنجاب میں پیپلز پارٹی کے ایم پی ایز کو بھی دبا کر رکھا تھا۔ مرکز نے جب اپنا چیف سیکرٹری بھیجنے کی کوشش کی تو میاں صاحب نے دھمکی دی کہ وہ اسے باغ جناح میں سپرنٹنڈنٹ لگا دیں گے اور کسی پی سی ایس افسر کو چیف سیکرٹری بنائیں گے۔ اس سلسلے میں سرفراز حسین شاہ کا نوٹیفکیشن بھی تیار کر لیا گیا۔ یہ جاننا تھا کہ سول سروس کے مرغان کلنگ سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ ان کے نزدیک یہ قیامت کے آثار تھے۔ اپنے تمام باہمی اختلافات کو بھلا کر انہوں نے بے نظیر کو درخواست کی کہ انور زاہد کو ہی پنجاب میں رہنے دیا جائے۔ بے شک دوسرے کیمپ میں ہے لیکن ہے تو اپنا ہی بھائی بند۔

مخدوم الطاف سے مخاصمت! مخدوم الطاف میاں صاحب سے خاصا ناراض تھا۔ وہ وزارت نہ ملنے کے دکھ میں مسلم لیگ چھوڑ کر پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑا اور کامیاب ہو گیا۔ وہ تنقید کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا اور ہر وقت انہیں مطعون کرتا۔ ایک دفعہ میاں صاحب رحیم یار خان آئے تو اس کا حریف مخدوم عماد الدین انہیں ملا اور کہنے لگا "مخدوم الطاف کو نیچا دکھانے کا ایک نادر موقعہ ہاتھ آیا ہے۔" اس کے بھائی کے کسی عورت سے تعلقات تھے۔ جب عورت نے بے رخی اختیار کی تو اس نے جوش رقابت میں اس کو اُسترے سے زخمی کیا

ہے۔ وہ عورت پرچہ درج کرانے کے لئے تیار ہے جس میں مخدوم الطاف پر بھی الزام تراشی کی جائے گی۔ پرچہ درج ہو گیا۔ الطاف کا بھائی گرفتار بھی ہوا۔ اب میاں صاحب کا اصرار تھا کہ مخدوم الطاف کو بھی ہتھکڑی لگائی جائے۔ میں نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ سیاسی دشمنی کو اس حد تک آگے نہ بڑھایا جائے کہ واپسی کا ہر راستہ بند ہو جائے۔ مخدوم الطاف طبعاً شریف انسان تھا۔ ایماندار تھا اور احمد محمود کی طرح اُس پر کرپشن کا کوئی الزام نہ تھا۔ ہر دوسرے دن میاں صاحب فون کر کے پوچھتے ''الطاف گرفتار ہوا ہے یا نہیں؟'' میں کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دیتا کہ کھسک گیا ہے، زیر زمین چلا گیا ہے۔ ریڈنگ پارٹی کے پہنچنے سے چند منٹ پہلے گھوڑے پر بیٹھ کر دریا کی طرف نکل گیا ہے۔ درحقیقت میں اسے کسی طور بھی گرفتار نہ کرنا چاہتا تھا۔ یہ بات میرے مزاج کے مطابق تھی اور نہ میاں نواز شریف کے مفاد میں تھی۔ بڑی سوچ بچار کے بعد جسٹس منیر کے پاس گیا۔ وہ ان دنوں بہاولپور بینچ میں تھے۔ میں نے انہیں سارا واقعہ سنایا اور درخواست کی کہ وہ مخدوم الطاف کی ضمانت قبل از گرفتاری منظور کرلیں۔ میری جان چھوٹ جائے گی۔ جج صاحب مسکرا دیئے۔ انہوں نے مخدوم الطاف کو بلا کر Bail befor arrest لے لی۔ اب جو میاں صاحب کا فون آیا تو میں نے انہیں ضمانت کا بتایا۔ بڑے ناراض ہوئے ''یہ کیسے ہو گیا ہے؟'' سب ریاستی ہیں۔ پرانے تعلقات ہیں۔ آپ فکر نہ کریں ہم عنقریب ضمانت منسوخ کرا لیں گے۔ اچھا کہہ کر وہ چپ ہو گئے۔ اس ایک لفظ میں کئی شکوک و شبہات چھپے ہوئے تھے۔

صبح سویرے نور کے تڑکے: سکول میں ماسٹر شرف دین ہمیں صبح کی خوبیاں گنواتے ہوئے ایک نظم پڑھاتے تھے جس کا پہلا شعر تھا، صبح سویرے نور کے تڑکے، سو کر اُٹھے اچھے لڑکے۔ ہر چند کہ اب لڑکپن رہا تھا اور نہ اپنے آپ میں کوئی ایسی اچھائی نظر آتی تھی جس پر خاص طور پر فخر کیا جا سکے لیکن سحر خیزی کی عادت میں نے کافی عرصہ سے پال رکھی تھی۔ علی الصبح آنکھ کھل جاتی اور سیر کے لئے نکل جاتا۔ جن لوگوں کو صبح کا سہانہ منظر دیکھنا نصیب ہوتا ہے انہیں علم ہے کہ اس میں واضح اشارے ہیں۔ جوش جیسے 'ملحد' کو بھی ثبوت حق مل گیا تھا۔ واپس آ کر میں تیار ہوتا اور ٹھیک وقت پر دفتر پہنچ جاتا۔ دفتر میں مشہور تھا کہ ڈی سی وقت کا بڑا پابند ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس میں کوئی لمبی چوڑی اصول پرستی کار فرما نہ تھی۔ جب آٹھ بجے سے پہلے تیار ہو جاتا تو پھر گھر میں محض وقت گزارنے کی کوئی تک نہ تھا۔ صبح جانے کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ بقیہ ڈاک نکل جاتی۔ سارا دن ملاقاتیوں اور سائلوں کا تانتا بندھا رہتا لیکن ان کی آمد دس بجے کے بعد شروع ہوتی۔ کوئی تصور بھی نہ کر

سکتا تھا کہ ڈپٹی کمشنر بہادر منشیوں کی طرح علی الصبح دفتر میں براجمان ہو جاتے ہیں۔ چونکہ میں نے ملاقات کے اوقات کار مقرر نہ کر رکھے تھے اس لئے یہ سلسلہ گھر جانے تک جاری رہتا۔ ملاقاتیوں میں ہر قسم کے لوگ ہوتے۔ اکثریت تو امداد مانگنے والوں کی ہوتی۔ بھلے وقتوں میں لوگ نسبتاً خوش حال تھے اس لئے تنگ دست بھی کم تھے۔ ملک میں خط غربت اس قدر تیزی سے گرا تھا کہ ایک نہیں کئی مہر بھریاں اور نور فاطمائیں دامن پھیلائے آ جاتیں۔ وہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ڈپٹی کمشنر کے پاس پیسے نہیں ہوتے۔ اگر کسی کو بتایا جاتا کہ اس مد میں حکومت نے کچھ نہیں دیا ہے، وہ اوّلاً تو یقین ہی نہ کرتا یا پھر ایسی نظروں سے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو۔ تم کیسے ڈپٹی کمشنر ہو جو ایک غریب کی امداد بھی نہیں کر سکتا۔ اُتارو یہ تہمت اور ہماری صف میں شامل ہو جاؤ۔ ڈپٹی کمشنروں نے اس نفسیاتی اُلجھن سے بچنے کے لئے ایک پرائیویٹ فنڈ قائم کیا جسے ویلفیئر فنڈ کہتے تھے۔ ہر وہ شخص جو اسلحے کا لائیسنس، ڈومیسائیل یا رجسٹری کروانے آتا اسے اس مد میں کچھ نہ کچھ دینا پڑتا۔ اس سے غریبوں کے علاوہ 'غریبوں' کی امداد بھی ہو جاتی۔ ضلع میں ہر وقت وزراء کی فوج ظفر موج دورے کرتی رہتی۔ وہ وزیر جو ضلع کے رہنے والے تھے وہ بھی بوجوہ ریسٹ ہاؤس میں قیام فرماتے۔ ان کے قیام وطعام اور ملاقاتیوں کی آؤ بھگت پر جو خرچ ہوتا وہ اسی مد سے پورا کیا جاتا۔ کسی زمانے میں یہ کام پٹواری کیا کرتے تھے۔ بھلے وقتوں میں کبھی کبھار وزیر آتے تھے۔ جب دورے بڑھے تو پٹواریوں نے ہاتھ کھڑے کر دیے۔ ایک دو ضلعوں میں تو ہڑتال تک ہو گئی۔ اس سلسلے میں جب اخباروں میں خبریں چھپیں تو حکومت نے فلاحی فنڈ پر پابندی عائد کر دی۔ وزراء کے کھاتے تو بند نہ ہوئے کیونکہ کوئی ڈی سی ان کی ناراضی مُول نہ لے سکتا تھا۔ انہوں نے واپس جا کر وزیر اعلیٰ کو یہ تو نہیں بتایا تھا کہ ان کے راتب میں کمی آ گئی ہے، زور اس بات پر دیتے کہ ضلع کے عوام ڈی سی سے ناخوش ہیں۔ تھانیداروں سے یہ کام اس لئے نہ لیا جا سکتا تھا کہ وہ وزیر کے نام پر علاقے میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیتے۔ ہر شریف آدمی کی جیب میں ہاتھ ڈال کر کہتے "جانتے نہیں وزیر صاحب آ رہے ہیں، کیا میرا باپ پیچھے مربعے چھوڑ گیا ہے کہ جیب سے خرچ کروں۔ ہم سے تو بڑے صاحبوں کی فرمائشیں ہی ٹھیک طرح سے پوری نہیں ہوتیں۔"

میں نے اس کے لئے یہ طریقہ نکالا کہ سائل کو چیئرمین میونسپل کمیٹی یا ضلع کونسل کے پاس بھیج دیتا۔ ان کے پاس Discretionary grant میں خطیر رقم ہوتی ہے۔ سیٹھ اسلم اور دیگر امیر آدمیوں کی خدمات سے بھی استفادہ کیا جاتا۔

علاقے کے ممبران اسمبلی بھی بلا ناغہ آتے، جس دن کوئی ممبر نہ آتا تو گمان ہوتا کہ بیمار ہو گیا ہے یا

پھر ناراض ہے۔ یہ اپنے ساتھ کاغذوں کا پورا پلندا لاتے اور سفارشوں کی بھرمار کر دیتے۔ زیادہ زور پٹواریوں، رجسٹری محرروں اور اسلحہ و ڈومیسائل برانچ کے اہلکاروں کے تبادلوں پر ہوتا۔ ان سب کا سرخیل لیاقت آباد کا ممبر صوبائی اسمبلی چوہدری مسعود تھا۔ اس کا تعلق ارائیں برادری سے تھا اور اس شخص نے راتوں رات امیر بننے کا گر سیکھ لیا تھا۔ اس قدر ہوشیار، چالاک، شرارتی اور کینہ طوز شخص پورے ڈویژن میں کوئی نہ تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ سرکاری اراضی اسے کسی نہ کسی طور دان کر دی جائے۔ اس کے متعلق یہ شکایات بھی عام تھیں کہ تحصیل کے ہر اہلکار سے منتھلی لیتا ہے۔ میں نے ہمیشہ اسے ایک ہاتھ کے فاصلے پر رکھا اور اپنے قریب نہ پھٹکنے دیا۔ اس بات کا اسے بڑا قلق تھا اور شکایت کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتا تھا۔ اس کا توڑ میں نے پہلے سے کر رکھا تھا۔ جب بھی وہ وزیر اعلیٰ کے پاس کسی دوسرے ممبر کو لے کر میری شکایت لگانے جاتا تو میں دیگر ممبران اصغر کریچہ اور سیٹھ اسلم کو بھیج دیتا۔ وہ اس کے خلاف شکایات کا ڈھیر لگا دیتے۔ وزیر اعلیٰ مخمصے میں پڑ جاتا کہ اصل ماجرہ کیا ہے۔ کسی بھی کامیاب فیلڈ افسر کے لئے ضروری ہے کہ وہ سب کو اکٹھا نہ ہونے دے اور تقسیم کر کے رکھے۔ جب کبھی بھی یہ یکجا ہو جائیں اور یک زبان ہو کر افسر کی شکایت لگائیں تو پھر اس کے لئے ٹھہرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمارے معاشرے کا مسئلہ یہ ہے کہ اگر ایک ممبر کے ننانوے کام ہو جائیں اور سوواں نہ ہو تو وہ

پچھلے کاموں کو بھول کر ناراض ہو جائے گا۔ ان معروضی حالات میں کیا کرنا چاہیے؟ ایک کامیاب فیلڈ افسر وہ ہے جسے How not to do a thing کا آرٹ آتا ہو۔ جو ناراضی اور مخاصمت کے فرق کو سمجھتا ہو۔ جو بااثر لوگوں کی نفسیات اور کمزوریوں سے آگاہ ہو۔ جو ناں بھی نہ کرے اور غلط کام کرنے سے بھی اجتناب برتے۔ کہنے کو تو یہ باتیں آسان لگتی ہیں لیکن عملی زندگی میں یہ عمل تنے ہوئے رسے پر بازی گر کی طرح چلنے کے مترادف ہے۔ پرانے آئی سی ایس اور سی ایس پی افسروں کو یہ دشواریاں نہ تھیں۔ ان کے خلاف شکایات کی شنوائی نہ ہوتی تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جو حکومتوں کو بناتے اور ہٹاتے تھے۔ اسی لئے اسے نوکر شاہی کہا جاتا تھا۔ فی زمانہ وزیر اعلیٰ اور وزیر اعظم کو ممبران کو ساتھ لے کر چلنا ہوتا ہے اور افسر چاہے کتنا ہی اچھا ایماندار اور اہل کیوں نہ ہو، حکومت کی ترجیحات میں دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ پھر پی سی ایس افسروں سے تو چیف سیکرٹری کو خدا واسطے کا بیر ہوتا ہے۔ وہ اس قسم کے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے حکومت کے کان بھرتے ہیں۔ ان حالات میں کیا کیا جا سکتا ہے یا کون سی حکومت عملی کارگر ثابت ہو سکتی ہے۔ گو انتظامی طریق سائنسی فارمولوں کی طرح تو نہیں ہوتا لیکن نئے افسروں کی رہنمائی کے لئے چند بنیادی اصول یہ ہیں۔

[جاری ہے۔]

میرا جسم میری مرضی

تحریر: موپساں
مترجم: عامر رضوی

ماہِ جون کے اواخر کی ایک سکون بخشنے والی حدت بھری شام کے ساڑھے پانچ بجے جب سورج پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا تو ایک بگھی، جس میں دو خوبصورت سیاہ گھوڑے جُتے ہوئے تھے، محل کے بیرونی صحن میں آ کر رکی۔

جیسے ہی بگھی کے پائیدان پہ بیگم نواب میس کیرٹ کے شوہر نے اترنے کے لیے قدم رکھا تو وہ محل سے باہر نمودار ہو کر بگھی کی جانب بڑھی۔ بیگم کو یوں آگے بڑھتے دیکھ کر نواب میس کیرٹ پہلے تو ٹھٹکا اور پھر اس کا رنگ زرد پڑ گیا۔ بیگم نواب بلاشبہ ایک انتہائی خوبصورت اور پرشکوہ خاتون تھی۔ اس کا زیتونی رنگت والا چہرہ بیضوی تھا، اور اس کی کشادہ آنکھیں بھوری رنگت کی تھیں۔ مزید یہ کہ اُس کے دراز بال چمکدار سیاہ رنگ کے تھے، جو اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے۔ نواب کے بگھی سے اترتے ہی وہ اس کی جانب بغیر دیکھے، یہاں تک کہ بغیر کوئی توجہ کیے بگھی پہ سوار ہونے لگی۔

'کیا تم سیر کرنے جانا چاہتی ہو؟' نواب نے پوچھا۔

'تم دیکھ سکتے ہو، ایسا ہی ہے۔' اس نے بیزاری سے جواب دیا۔

'کیا بوئیس ڈی بولان جانے کا ارادہ ہے؟'

'شاید---'

'تو کیا میں تمھارے ساتھ چل سکتا ہوں؟'

'یہ بگھی تمھاری ہی ہے۔'

نواب کسی حیرت کا اظہار کیے بغیر بگھی میں سوار ہو کر اپنی بیگم کے ساتھ براجمان ہو گیا۔

'بوئیس ڈی بولان۔' نواب نے بگھی بان کو حکمیہ لہجے میں کہا۔

جیسے ہی گھوڑے سر ہلاتے اور بگھی کو کھینچتے ہوئے گلی میں چلنے لگے تو خدمت گار بھی اُچک کر بگھی میں سوار ہو گیا اور بگھی بان کے پیچھے اپنی مخصوص نشست پہ بیٹھ گیا۔

ساتھ ساتھ بیٹھے بیگم اور نواب خاموش تھے۔ تاہم نواب سوچ رہا تھا کہ گفتگو کا آغاز کیسے کرے۔ لیکن بیگم کے چہرے پہ چھائی سختی اس کے آڑے آ رہی تھی۔ آخر کار اُس نے مکاری کا سہارا لیتے ہوئے اپنا ہاتھ بیگم کے دستانہ اوڑھے ہوئے ہاتھ سے یوں مس کیا جیسے یہ اُس سے نادانستگی میں ہو گیا ہو۔ مگر بیگم نے اپنا ہاتھ جس طور پیچھے کھینچا اُس میں نفرت کا اظہار نمایاں تھا۔ پھر بھی وہ اپنی مطلق العنان طبیعت پہ قابو پاتے ہوئے گویا ہوا:

'گیبرائیل---'

'کیا بات ہے؟ تم کیا چاہتے ہو؟'

'تم بے حد پیاری لگ رہی ہو۔'

مگر بیگم ایک تنگ آئی اور چڑچڑی ملکہ کی طرح خاموش رہی۔ اس دوران شام گہری ہو چکی تھی اور سورج کے ڈوبنے کا آسمان پہ سرخی بکھیرتا منظر انتہائی مسحور کن تھا۔

'میری پیاری گیبرائیل---' نواب نے بات کو جاری رکھنے کی غرض سے کہا۔

'کیا میں تھوڑی دیر بھی پرسکون نہیں رہ سکتی؟ خود پہ قابو نہ پاتے ہوئے بیگم نے غصیلی آواز میں کہا۔ 'کیا میں اپنی بگھی میں بھی کہیں اپنی مرضی سے نہیں جا سکتی؟'

'تم اس سے پہلے کبھی اتنی حسین نہیں لگیں۔' نواب نے سنی ان سنی کرتے ہوئے کہا۔

اب بیگم نواب کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ چنانچہ اس نے ناقابلِ برداشت غصے سے کہا۔ 'میں قسمیہ کہتی ہوں کہ تم انتہائی غلط سوچ رہے ہو۔ اور میں ایک بار پھر ایسا کچھ بھی نہیں کرنے والی، جیسا تمھارے دماغ میں چل رہا ہے۔'

یہ سنتے ہی نواب اپنی تکبرانہ حیثیت کا احساس کرتے ہوئے غصے سے بے قابو ہونے لگا۔

'تمھارا مطلب کیا ہے؟ اور تم کیا کہنا چاہتی ہو؟' اپنے لہجے سے اب وہ اس کے عاشق کے بجائے اس کا ظالم آقا معلوم ہو رہا تھا۔

'آہ--- بہت خوب، میرا کیا مطلب ہے۔' بیگم نے اپنی آواز کو پہیوں کے شور میں دباتے ہوئے نسبتاً آہستہ آواز میں کہا تا کہ دونوں نوکر نواب اور اُس کے درمیان ہونے والی گفتگو نہ سُن سکیں۔ 'کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمھیں ہر بات صاف صاف بتا دوں؟' بیگم نے اپنی بات کو مکمل کرتے

ہوئے کہا۔
'ہاں۔'
'جب سے میں تمھاری خود غرضی کا نشانہ بن رہی ہوں، تمھارا ہر عمل میرے دل پہ ایک بوجھ ہے۔'
'مجھے ہر بات بتاؤ۔' نواب کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا اور وہ دانت پیستے ہوئے غرایا۔
وہ ایک دراز قد، چوڑے شانوں والا وجیہ مرد تھا۔ اُس کی داڑھی سرخ تھی جو اُس کے چہرے پہ بہت بھلی لگتی تھی۔ اور یہ کہ وہ ایک بہترین شوہر اور بہترین باپ تھا۔ اور اب اُس کی بیگم نے پہلی مرتبہ اُس کے چہرے کو کچھ دیر غور سے دیکھا اور پھر کہنے لگی، 'افسوس کے میں تمھیں ایک حد درجہ ذلت آمیز راز سے آگاہ کرنے لگی ہوں۔ اور مجھے کسی قسم کے خوف کا سامنا نہیں۔ یہاں تک کہ مجھے تمھارا بھی کوئی خوف نہیں کیونکہ میں اُس کے لیے مکمل طور پر تیار ہوں۔'
'تم پاگل ہو گئی ہو۔' نواب خود بھی غصے سے کانپنے لگا تھا اور اُس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے کہہ رہا تھا۔
'نہیں، بلکہ یہ کہ میں اب تمھارے ساتھ شادی کرنے کا نفرت آمیز خمیازہ، گیارہ سال سے تمھارے بچے پیدا کرنے کی صورت میں، مزید نہیں بھگت سکتی۔ میں بھی اور خواتین کی طرح سوسائٹی میں اپنا جائز مقام حاصل کرنا چاہتی ہوں۔'
'میں سمجھ نہیں پا رہا ہوں کہ تم کیا کہہ رہی ہو۔' نواب نے ہکلاتے ہوئے کہا۔
'تم اچھے سے جانتی ہو کہ میں کیا کہہ رہی ہوں۔ مجھے اپنا آخری بچہ جنے ہوئے بمشکل تین ماہ ہوئے ہیں۔ تمھاری میرا جسمانی حلیہ بگاڑ دینے کی ہر کوشش کے باوجود میری جسمانی خوبصورتی ویسی کی ویسی ہے۔ اِس کا اندازہ تمھیں اب سے تھوڑی دیر پہلے مجھے دیکھ کر بھی ہوا، اور پھر تم مجھ سے ایک اور بچہ پیدا کرنے کا سوچنے لگے۔'
'تم انتہائی فضول گفتگو کر رہی ہو۔'
'نہیں، میں فضول گفتگو نہیں کر رہی۔ میری عمر تیس برس ہے اور ہماری شادی ہوئے گیارہ سال بیت چکے ہیں۔ ان گیارہ سالوں میں میں نے سات بچے جنے۔ تم اب مزید دس سال تک یہ عمل جاری رکھنے کا ارادہ کیے ہوئے ہو۔ اور یوں تم اپنی حسد کی آگ بجھا کر علیحدہ ہو رہو گے۔'
'میں تمھیں مزید کچھ کہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔' نواب نے اس کا بازو پکڑ کر دباتے ہوئے کہا۔
'اور میں نے تمہیہ کیا ہے کہ میں اپنی بات کو مکمل کر کے رہوں گی۔ اگر تم نے مجھے روکنے کی کوشش کی تو میں بلند آواز میں بات کروں گی تاکہ دونوں خدمت گار، جو ہمارے ساتھ محوِ سفر ہیں، وہ بھی سُن لیں۔ لہٰذا اب خاموشی اور توجہ سے میری بات سنو۔ یہ کہ میں نے تم سے ہمیشہ شدید نفرت کی۔ اور تم یہ جانتے بھی ہو، کیونکہ میں کبھی

جھوٹ نہیں بولتی۔ میرے والدین کے مالی مشکلات میں جکڑے ہونے کا فائدہ اٹھا کر تم مجھ سے شادی کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ میرے آنسوؤں بھرے احتجاج کے باوجود انہوں نے مجھے تمھارے حوالے کر دیا کیونکہ تم دولتمند تھے۔

چنانچہ تم نے مجھے خرید لیا۔ پھر جیسے ہی میں تمھاری زندگی کی ساتھی بنی اور تمھاری حاکمیت میں آئی تو تم نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں صرف اور صرف تم میں دلچسپی لوں۔ اور تمھیں زیادہ سے زیادہ پیار کروں۔ یعنی تمھاری لونڈی بن کر جیوں۔ اور تم نے مجھ سے انتہا درجے کا حسد کیا۔ تمھاری کوشش رہی کہ تم مجھے مکمل طور پر نا قابلِ قبول بنا دو۔ ابھی ہماری شادی کو بمشکل آٹھ ماہ گذرے تھے کہ تم نے مجھ پہ شک کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ کسقدر ہتک کی بات تھی۔ اور چونکہ تم میری خوبصورتی کے آگے کوئی بند نہیں باندھ سکے تو ہر محفل، یہاں تک کہ اخبارات میں میرے حسن کے چرچے اس حد تک ہونے لگے کہ مجھے پیرس کی سب سے زیادہ حسین خاتون کہا جانے لگا۔ تب تم نے میرے مداحوں کو مجھ سے دور رکھنے کی غرض سے مجھے دھڑا دھڑ بچے جننے کے کام پہ لگا دیا۔ تاکہ یوں میں اپنی نسوانی خوبصورتی سے ہاتھ دھو کر سب لوگوں کے لیے نا قابلِ قبول ہو جاؤں۔ اور اب خدا کے لیے اس سے انکار نہ کرنا۔ تم نے اپنے اس کریہہ منصوبے کا ذکر اپنی بہن سے بھی کیا تھا۔ مگر وہ کیا کہ وہ مجھے بہت پسند کرتی ہے۔ چنانچہ اُس نے تمھارے بارے میں نفرت کا اظہار کرتے ہوئے مجھے سب بتا دیا۔

'ہائے افسوس، ذرا سوچو تم نے ماضی میں میرے ساتھ کیسا سلوک روا رکھا۔ کیسے تم نے مجھے گیارہ برس تک مجبور کیے رکھا کہ میں صرف بچے جنتی اور انہیں پالتی پوستی رہوں۔ تم نے اس پہ بھی بس نہیں کی اور مجھے گاؤں میں زمینوں پر بھیج دیا تاکہ سوسائٹی کے لوگ مجھے بھول بھال جائیں۔ لیکن جب میں وہاں سے مزید تروتازہ ہو کر لوٹی تو میرے چاہنے والے لوگوں کا حلقہ مزید وسیع تر ہو گیا۔ اور جب میرے دل نے امید باندھ لی کہ میں سوسائٹی میں اپنا اعلیٰ مقام کچھ عرصہ مزید قائم رکھ سکوں گی تو تمھارے دل میں میرے لیے حسد کا مزید اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ اسوقت بھی تم مجھے بدصورتی میں ڈھالنے اور یوں سوسائٹی سے دور رکھنے کی غرض سے بچے جننے کے کام پہ لگانا چاہتے ہو۔ گو تم جانتے ہو کہ میں خود کو تمھیں سونپنے سے کبھی انکار نہیں کرتی۔ لیکن تمھاری مخصوص غرض سے خواہش مجھے کریہہ لگتی ہے۔ میں اب ایسا کرنے کو ہرگز تیار نہیں۔

'تم نے اِس عرصے میں مکاری سے کام لیتے ہوئے بچوں کو پدرانہ شفقت دے کر خود کو محفوظ کر لیا اور میں جس نے انہیں جنم دینے کی اذیتیں جھیلی تھیں، تنہا ہو گئی۔ اور یہ بات تمھارے لیے خوشی کا باعث بنی کہ میں

اپنی نسوانی کشش کھونے لگی ہوں۔
'آہ۔ تمھاری آنکھوں میں موجود خوشی سے میں سمجھ جاتی کہ تم بچوں سے اس لیے محبت نہیں کرتے تھے کہ وہ تمھارا خون ہیں، بلکہ اس لیے کہ مجھے تنہا کر کے تم خود کو فاتح سمجھتے تھے۔ وہ سب تمھارے لیے تمھاری میرے اوپر فتح کے مظاہر تھے۔ اسی وجہ سے تم انہیں سیر کرانے لے جایا کرتے۔ انہیں گدھے کی سواری کرایا کرتے اور تھیٹر لے جایا کرتے۔ ظاہر ہے کہ اس پہ لوگ کہا کرتے کتنا شفیق باپ ہے اور یہ بات تمھارے لیے فخر کا باعث ہوا کرتی۔'
یہ سب سُن کر نواب نے اُس کے بازو کو جنگلیوں کے سے انداز سے اس وحشیانہ طریقے سے بھینچا کہ وہ تکلیف سے قریباً کراہ اٹھی۔ پھر نواب نے سرگوشی کے انداز میں اس سے کہا:
'میں اپنے بچوں سے محبت کرتا ہوں--- تم سن رہی ہو نا۔ تمھارا یہ سب کہنا ایک ماں کے لیے ہتک آمیز بات ہے۔ تم میری ملکیت ہو۔ میں مالک ہوں --- تمھارا مالک۔ میں تم سے یہ سب حاصل کرنے کا حق رکھتا ہوں اور اس کے لیے قانون میرے ساتھ ہے۔'
یہ کہتے ہوئے نواب اپنے طاقتور ہاتھ سے اس کی انگلیاں سختی سے مروڑ رہا تھا۔ وہ شدید تکلیف کی حالت میں اپنا ہاتھ چھڑانے کی بے سود کوشش کر رہی تھی۔ درد کی شدت اس کا سانس اکھیڑنے کے درپے تھی اور اس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے تھے۔
'تم سمجھ گئی ہو نا کہ میں طاقتور ہوں اور مالک ہوں۔' نواب نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔
'کیا تمھارے خیال میں میں ایک مذہبی خاتون ہوں؟' جب نواب کی گرفت اس کے ہاتھ پہ کچھ ڈھیلی پڑی تو اس نے نواب سے پوچھا۔
'ہاں---' نواب نے حیرانگی سے ہکلاتے ہوئے جواب دیا۔
'کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر میں کلیسا میں جا کر یسوع مسیح کو گواہ بنا کر جھوٹ بول سکتی ہوں؟'
'نہیں۔'
'تو تم کیا میرے ساتھ کسی کلیسا میں چلو گے؟'
'کس لیئے؟'
'تم جان جاؤ گے۔'
'اگر یہ تمھاری شدید خواہش ہے تو ہاں میں چلتا ہوں۔'
'فلپ کلیسا۔' تب بیگم نواب نے بلند آواز سے کہا۔
نواب اور بیگم مزید کوئی بات کیے بغیر جیسے ہی کلیسا پہنچے تو بیگم نواب تیزی سے بگھی سے نیچے اُتر آئی۔ پھر نواب کچھ فاصلہ رکھتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑا۔ بغیر کہیں رکے کلیسا میں داخل ہو کر بیگم جیسے ہی مقدس مقام پر پہنچی تو گھٹنوں پر جھک کر اس نے اپنا چہرہ اپنے دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور دیر

تک کوئی دعا پڑھتی رہی۔ نواب، جو اس کے پیچھے کھڑا تھا، نہیں دیکھ سکا کہ وہ بغیر آواز پیدا کیے عورتوں کے مخصوص اس انداز میں رو رہی ہے، جب وہ بہت ذہنی اذیت میں ہوں۔

پھر جب نواب نے محسوس کیا کہ کچھ زیادہ ہی دیر لگ رہی ہے تو اس نے نرمی سے اس کے کاندھے کو چھوا۔ اپنے کاندھے پہ لمس محسوس کرتے ہوئے وہ اپنے حواس میں واپس آ گئی۔ ایک جھٹکے جانے کی سی کیفیت کے ساتھ کھڑی ہو کر اس نے اپنی آنکھیں نواب کی آنکھوں میں ڈال دیں۔

ہاں مجھے تمھیں آگاہ کرنا ہے،' اس نے کہنا شروع کیا۔ 'مجھے کوئی خوف نہیں کہ تم میرے ساتھ کیا سلوک کرو گے۔ تم چاہو تو بے شک مجھے یہ جان کر قتل کر دو کہ تمھارے بچوں میں سے ایک بچہ تمھارا نہیں ہے۔ ہاں اُن میں سے صرف ایک تمھارا نہیں ہے۔ اور یہ بات میں خداوند کو گواہ بنا کر کہہ رہی ہوں۔ میرے لیے تم سے تمھاری ان زیادتیوں کا، جن کی بناء پر مجھے مسلسل بچے جننے اور انہیں پالنے پوسنے کی تکالیف سہنا پڑیں، بدلہ لینے کا واحد طریقہ یہی تھا۔ میرا وہ عاشق کون تھا؟ یہ تم کبھی نہیں جان سکو گے۔ تم ہر کسی پہ شک کر سکتے ہو۔ مگر اُس شخص کو کبھی پہچان نہیں پاؤ گے جس سے بغیر کوئی تلذذ اٹھائے میں نے اپنا آپ اُس کے حوالے کر دیا۔ یہ سب میں نے صرف تم سے بے وفائی کرنے کی غرض سے کیا۔ اس شخص سے نے بھی مجھے ماں بنا دیا۔ مگر جس بچے کا بنایا، وہ تم کبھی نہ جان سکو گے۔ میرے سات بچے ہیں، ذرا کوشش تو کر کے دیکھو یہ معلوم کرنے کی کہ کونسا بچہ تمھارا نہیں ہے۔ تم سے یوں بدلہ لینے کا میں تمھیں کبھی بعد میں بتانا چاہتی تھی، مگر تم نے آج مجھے اقرار کرنے پر مجبور کر دیا۔ میں نے جو کہنا تھا کہہ چکی۔'

نواب کے گھونسے کا دفاع کرنے کے بعد وہ تیزی سے کلیسا کے کھلے دروازے کی طرف بڑھنے لگی۔ اس دوران اس کے ذہن پہ نواب کے قدموں کی آہٹ کا خوف سوار تھا۔

'گھر۔' باہر نکل کر سرعت سے بگھی میں سوار ہوتے ہی اس نے بگھی بان سے کہا۔ فوراً ہی گھوڑے تیزی سے روانہ ہو گئے۔

(۲)

بیگم نواب اپنی موت کے آنے والے لمحے کے بارے میں سوچتے ہوئے اپنے کمرے میں ڈنر کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ کیا اُس کا شوہر واپس آ گیا ہے، اور یہ کہ وہ کیا کرنے والا ہے۔ جذباتی اور پرتشدد طبیعت کا حامل وہ شخص کیا فیصلہ کر رہا ہوگا۔ گھر میں مکمل خاموشی تھی اور وہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کلاک پہ وقت دیکھ رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر پہلے اُس کی خاتون خادمہ اس کا لباس تبدیل کرنے اور اُسے تیار کرنے کے بعد اُس کے کمرے سے رخصت ہو چکی تھی۔ پھر تقریباً اسی وقت جب کلاک نے آٹھ بجنے کا گھنٹہ بجایا، تو دروازے پر دستک ہوئی اور بٹلر نے ڈنر تیار ہونے کی اطلاع دی۔

'کیا نواب صاحب آ گئے ہیں؟' اس نے بٹلر سے پوچھا۔
'جی ہاں مالکن۔ وہ کھانے کے کمرے میں ہیں۔'
کچھ لمحوں کے لیے اس نے اپنے ساتھ اپنا ریوالور، جو اس نے کچھ ہی روز پہلے خریدا تھا، لے جانے کے بارے میں سوچا۔ مگر بچوں کے وہاں موجودگی کا سوچ کر یہ ارادہ ترک کر دیا۔ البتہ بے ہوشی سے ہوش میں لانے والی دوائی کی شیشی ساتھ رکھ لی۔ کھانے کے کمرے میں اسے دیکھ کر نواب آداب بجالانے کے لیے سرسری سا اپنی نشست سے اٹھا۔ چند لمحوں کے لیے وہ دونوں کورنش بجالانے کے سے انداز میں ہلکا سا جھکے۔ میز پہ بیگم نواب کے دائیں جانب اسکے تین بیٹے اور ان کا اتالیق مسٹر ایبے مارٹن بیٹھے تھے۔ اور بائیں جانب تین بیٹیاں اور ان کی انگریزی کی گورنس مس سمتھ بیٹھی تھیں۔ سب سے چھوٹا بچہ جو ابھی تین ماہ کا تھا، اپنی نرس کے پاس اوپر کی منزل پہ تھا۔
اتالیق نے حسب معمول کچھ ابتدائی کلمات ادا کیے اور کھانے کا آغاز ہو گیا۔ بیگم اپنے ذہنی دباؤ کی بنا پر مسلسل آنکھیں جھکائے بیٹھی تھی، جبکہ نواب نے تینوں بیٹوں کی کسی نہ کسی بات پر سرزنش کی۔ پھر وہ اسی عمل کو دہرانے کے لیے بیٹیوں کی جانب متوجہ ہوا۔ اچانک اس دوران جب وہ اپنی مے کے گلاس کو ایک جانب ہٹانے لگا تو وہ گر کر ٹوٹ گیا اور مے میز پوش پر پھیل گئی۔ یہ دیکھ کر بیگم نے جب اپنی نشست سے اٹھنا چاہا تو پہلی مرتبہ دونوں نے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ اور پھر دونوں درمیان میں تناؤ ہونے کے باوجود وقتاً فوقتاً بجلی کی سی تیزی کے ساتھ ایک دوسرے کی جانب دیکھتے رہے۔
اتالیق نے محسوس کیا کہ دونوں کے بیچ کوئی کشیدگی چل رہی ہے۔ اگرچہ اس نے بات جاری کرنے کی غرض سے ایک کے بعد دوسرا موضوع چھیڑا، مگر نواب نے ایک بھی لفظ منہ سے نہیں نکالا۔ البتہ بیگم نے اپنی نسوانی جبلت، اور دنیا بھر کی عورتوں کی مخصوص چالاکی کے تحت چند مرتبہ کچھ کہنا چاہا مگر ذہنی الجھن کی بنا پر وہ ٹھیک سے کہہ نہیں پا رہی تھی اور وسیع و عریض کمرے میں پلیٹوں یا پھر چمچوں کی آواز کا راج تھا۔
اچانک اُس کے شوہر نے آگے کی جانب جھکتے ہوئے کہا، 'کیا تم یہاں ان بچوں کے درمیان بیٹھے ہوئے مجھے یقین دلا سکتی ہو کہ جو کچھ تم نے کہا تھا وہ سچ ہے؟'
وہ نفرت جو اُس کی رگوں میں نواب کے دوڑ رہی تھی، اسی کی سختی سے، اس نے ایک ہاتھ سے لڑکوں کی، اور دوسرے ہاتھ سے لڑکیوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے، بلند اور یقینی لہجے میں کہا، 'میں ان بچوں کے سر کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ جو کچھ میں نے کہا وہ سچ ہے۔'
نواب نے غصے سے نیپکن کو میز پہ پھینکتے اور

کرسی کو پیچھے دھکیل کر دیوار سے ٹکراتا ہوا کھڑا ہوگیا اور پھر کچھ اور کہے بغیر تیزی سے کمرے سے باہر چلا گیا۔ جبکہ بیگم نواب نے ایک گہری سکون بخش ایسے سانس لی جیسے اس نے اس معرکہ میں پہلی فتح حاصل کرلی ہو۔ 'بچو، تم اپنے والد کے سخت لہجے سے خوف زدہ مت ہوجانا۔ دراصل وہ کسی وجہ سے پریشان ہے اور کچھ روز میں ٹھیک ہو جائے گا۔'

پھر کچھ دیر اس نے اتالیق اور گورنس سے بچوں کی تعلیم و تربیت کے بارے میں ایک شفیق ماں کی طرح نرم اور دل پذیر لہجے میں بات کی۔

کھانا کھا چکنے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں چلی گئی اور بچے اس کے پیچھے چلے آئے۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد جب سونے کا وقت ہوگیا تو اس نے ہر بچے کو دیر تک پیار کیا۔ پھر وہ اپنے سونے کے کمرے میں چلی آئی۔

وہ انتظار کرنے لگی، کیونکہ اسے یقین تھا کہ نواب کمرے میں ضرور آئے گا۔ وہ آنے والے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھی۔ چونکہ اب بچے اس کی حفاظت کے لیے وہاں نہیں تھے، لہٰذا اُس نے گولیوں بھرا پستول اپنی جیب میں رکھ لیا۔ وقت گذرتا گیا، کلاک ہر گھنٹے کے بعد اگلا گھنٹہ بجنے کا اعلان کرتا رہا۔ پورے گھر میں سوائے گھوڑا گاڑیوں کے گذرنے کی آواز کے سوا کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔

وہ انتظار کرتی گئی، مگر کسی خوف کے بغیر وہ ہر طرح کے معاملے کے لیے تیار تھی۔ اپنی فتح سے سرشار، وہ اسے ہر لمحے ذہنی اذیت میں مبتلا رکھنے کا طریقہ ڈھونڈ چکی تھی۔

مگر جب پو پھٹنے کی روشنی کمرے میں پھیلنے لگی تو نواب کے اب تک نہ آنے نے اُسے حیرانگی سے دوچار کردیا۔ اس کی غیر موجودگی نے اسے بالآخر بے چین کرنا شروع کردیا۔ تب اس نے اٹھ کر دروازے کو بند کیا اور چٹخنیاں چڑھانے کے بعد آ کر بستر پر دراز ہوگئی۔ تاہم اُس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں، اور وہ یہ سوچتے ہوئے کہ نواب کیا کرنے والا ہے، جاگ رہی تھی۔

پھر جب اس کی خادمہ اس کے لیے چائے لے کر آئی تو چائے کے ساتھ اس نے نواب کا دیا ہوا خط اس کے حوالے کیا۔ نواب نے لکھا تھا کہ وہ ایک لمبے سفر پہ جا رہا ہے، اور اس نے اپنے وکیل سے اسے اخراجات کی رقم ادا کرتے رہنے کا کہہ دیا ہے۔

(۳)

یہ ایک اوپرا تھیٹر میں چلنے والے دو ایکٹ کے کھیل 'رابرٹ اور شیطان' کے درمیانی وقفے کے درمیان حاضرین کی موجودگی کا ایک منظر تھا۔ مرد حضرات سروں پہ ہیٹ سجائے، اعلیٰ ملبوسات زیب تن کیے ہوئے تھے۔ ان کے کوٹ سامنے سے کھلے ہوئے تھے تاکہ وہ اپنی سفید نفیس شرٹس کی نمائش کر سکیں۔ ان کی نگاہیں باکسز میں براجمان

خواتین پہ مرکوز تھیں۔ اصلی اور نقلی ہیرے جواہرات سے لدی پھندی خوبصورت خواتین اپنے نرم اور سفید کاندھوں کی نمائش کی غرض سے نیم عریاں لباس پہنے ہوئے تھیں۔ دو دوست جن کی پشت آرکسٹرا کی جانب تھی، زیورات سے آراستہ خواتین کے حسن سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ ان میں سے راجر ڈی سیلین نام والے نے اپنے دوست، برنارڈ گرینڈین سے کہا:

'ذرا دیکھو تو سہی، بیگم نواب میس کیرٹ اب بھی کتنی خوبصورت ہے۔'

'اُس کی چونکا دینے والی خوبصورتی نے ہال میں موجود سبھی نگاہوں کو اپنی جانب متوجہ کیے ہوا ہے۔ وہ اب تک جوان ہے اور اپنی زیتونی رنگت کی بنا پر کسی مجسمہ کی طرح حسین نظر آ رہی ہے۔ اوپر سے اُس کے سیاہ بالوں میں جڑا ہیرا اسے مزید دلکش بنا رہا ہے۔'

دوسرے نے مڑ کر بیگم نواب کی جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

'تم اُسے خوبصورت کہہ سکتے ہو' جب دوسرے دوست کو بیگم نواب کی جانب دیکھتے ہوئے کافی دیر ہو گئی تو پہلے نے اس سے ازراہِ مذاق کہا۔

'تمھارے خیال میں اس کی عمر کیا ہو گی؟'

'ٹھہرو۔ میں تمھیں ٹھیک سے بتا سکتا ہوں کیونکہ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ یہ بھی کہ کس عمر میں اس نے سوسائٹی میں اٹھنا بیٹھنا شروع کیا۔ وہ اب چھتیس — ہاں چھتیس برس کی ہو گئی ہے۔'

'ناممکن---'

'میں پورے وثوق سے کہہ رہا ہوں۔'

'وہ بمشکل پچیس کی لگتی ہے۔'

'اور وہ سات بچوں کی ماں بن چکی ہے۔'

'یقین نہیں آتا۔'

'سچ کہہ رہا ہوں۔'

'اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ساتوں کے سات بچے زندہ ہیں۔ میں کبھی کبھی اس کے گھر جاتا رہتا ہوں جو نہایت پروقار اور پرسکون کہلانے کا مستحق ہے۔'

کتنی عجیب بات ہے--اُس کے بارے میں کوئی ناشائستہ خبر؟'

'کبھی نہیں۔'

'اس کے شوہر کے بارے میں بتاؤ۔ سنا ہے وہ بہت عجیب آدمی ہے۔'

'ہے بھی اور نہیں بھی۔ بہرحال کچھ ڈرامائی سی بات سننے میں آئی ہے لیکن ٹھیک سے تفصیل معلوم نہیں ہو سکی۔'

'پھر بھی، ایسی کیا بات ہے؟'

'اس کا شوہر اب خاصی ہنگامہ خیز زندگی گذار رہا ہے، پہلے چڑچڑی اور غصیلی طبیعت کا مالک شوہر تھا۔'

اُس کے بعد دونوں دوست کافی دیر تک اُن کی زندگی کی تکلیفوں کے بارے میں اپنے اندازے لگاتے رہے۔ پھر راجر ڈی سیلین نے، جو اب تک بیگم نواب کی جانب اوپرا دیکھنی والی مخصوص عینک لگائے دیکھ رہا

تھا، کہنے لگا، 'یہ یقین آنا ناممکن ہے کہ اس خاتون کے سات بچے ہوں گے۔'

'ہاں گیارہ سالوں میں، جب وہ محض تیس برس کی تھی تو اُس نے مزید بچے پیدا کرنے سے انکار کر دیا، تاکہ وہ سوسائٹی میں اپنی جگہ بنا سکے۔ جیسا کہ یہ اب بھی کر رہی ہے۔'

'بیچاری عورت!'

'تمھیں اُس پہ اتنا ترس کیوں آ رہا ہے؟'

'مجھے ترس کیوں آ رہا ہے؟ میں بتاتا ہوں۔ ذرا سوچو اپنی خوبصورت جوانی کے گیارہ سال اُس نے کس اذیت میں رہ کر بچے پیدا کرنے والی مشین بن کر ضائع کیئے ہوں گے۔'

'اس میں کسی کا کوئی قصور نہیں بنتا۔ ایسا ہونا تو صرف نیچر کا تقاضا تھا۔'

ہاں ایسا ہی ہے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ نیچر ہماری دشمن ہے۔ یہ ہمیں مسلسل واپس جانوروں والی زندگی میں دھکیلنے کی کوشش میں مصروف رہتی ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ خداوند کوئی بھی شے نفیس اور صاف ستھری حالت میں پیدا نہیں کرتا۔ اُسے اعلیٰ اور کارآمد شکل دینے کا سہرا حضرت انسان کے ذہین دماغ کے سر جاتا ہے۔ یہ انسان ہی ہے جس نے خام اور بدوضع صورت میں ظہور میں آئی ہوئی تخلیقات کو پُرکشش اور پراسرار حُسن عطا کیا۔ انسان نے شاعری کے زور پہ خیال کو رنگینی عطا کی۔ انسان نے آرٹ اور سائنس سے کام لیتے ہوئے تخلیقات کو اچھوتے انداز میں دیکھتے ہوئے ترقی عطا کی۔ بیشک اُس سے سائنسی کاموں میں کچھ غلطیاں بھی ہوئیں، تاہم اس نے اپنے مطمعِ نظر کو بالآخر پالیا۔ اس نے نیچر کی پوشیدہ خوبصورتی کا اجاگر کیا۔ خداوند کی مخلوقات نامکمل اور اپنی ابتدائی سی شکل میں ہوتی ہیں۔ اُن میں موجود جراثیموں کی بنا پر ان کی بقا انتہائی مشکلات سے دوچار ہوتی ہے، اور وہ چند سال تک اپنی حیوانی خواہشات کی تکمیل کے بعد بوڑھے اور کمزور ہو جاتے ہیں۔ لگتا ہے کہ خداوند نے پہلے تو مخلوقات کو اپنی نسل آگے بڑھانے کے لیے ذلت آمیز راستہ مہیا کیا اور پھر چند سالوں کا بدصورت بوڑھاپا عطا کرنے کے بعد موت کی نیند سلا دیا۔ اور جو میں نے یہ کہا کہ اُس نے مخلوقات کو اپنی نسل بڑھانے کے لیے ذلت آمیز راستہ مہیا کیا، تو میں اپنے اس قول پہ قائم ہوں۔ پھر اس سے بڑھ کر اور ذلت کیا ہوگی کہ نفیس اور اعلیٰ دماغ رکھنے والوں نے اس طریقے کے خلاف ہمیشہ بغاوت کی۔ کیونکہ اُس تنگ ہاتھ رکھنے والے کنجوس تخلیق کار نے ہمارے ہر عضو کے ذمہ دو دو فرائض لگائے۔ جبکہ اسے ہر عضو کے ذمے صرف ایک فرض لگانا چاہیے تھا۔ وہ نسل بڑھانے کا کوئی اور طریقہ بھی مہیا کر سکتا تھا۔ کیوں اُس نے اسے ہماری حیوانی خواہش پوری کرنے کے عمل سے منسلک کر دیا۔ ہمارا منہ، جو ہمیں زندہ رہنے کے لیے خوراک مہیا کرنے کا ذمہ دار

ہے، اُس کے ذمہ خیالات کو آواز کی شکل دے کر ادا کرنے کی اضافی ذمہ داری لگا دی۔ ہمارے پھیپڑوں کو سانس مہیا کرنے والے اعضا کے ذمہ خوشبو اور بدبو کو دماغ تک پہنچانے کا فرض بھی لگ دیا۔ ہمارے کان جو ہمیں دوسروں سے بات چیت کر وانے کے ذمہ دار ہیں، انہی کے بل بوتے پہ ہم نے موسیقی اور شاعری ایجاد کی۔ اُس تنگ نظر تخلیق کار کو چاہیے تھا کہ نسل کو آگے بڑھانے کی ارفعیٰ و اعلیٰ ذمہ داری کو مرد اور عورت کے اختلاط کے حوالے نہ کرتا بلکہ کسی اور طریقے سے اسے سرانجام دلواتا۔ تاہم انسان نے اس کے بل بوتے پر محبت کو خلق کر لیا۔ یہی محبت شاعری اور ادب کے درود کی وجہ بنی۔ اور پھر ہم سے کچھ ایسے لوگ جو خود کو شاعری اور ادب کے دھوکے سے نہیں بہلا سکتے تھے، انہوں بلا کسی تردود کے، مرد اور عورت کے اختلاط کے اس عمل سے بے راہروی اور برائی کی راہ اختیار کی، جو اپنے طور اُس تنگ نظر تخلیق کار کا مذاق اڑانے کا ایک ذریعہ ہے۔

'تاہم، ایک عام مرد، قانون کے سہارے کی بنا پر جانوروں کی طرح بچے حاصل کرتا ہے۔

'اب ذرا اس کو خوبصورت بیگم نواب کو دیکھو۔ یہ جو اپنے بے مثال حُسن کی بنا پر سوسائٹی میں ایک منفرد مقام رکھتی ہے، اسے گیارہ سال تک مجبور رکھا گیا کہ وہ شہر کے ایک نواب کے لیے اس کے وارث پیدا کرے۔'

یہ سننے کے بعد برنارڈ گرینڈین نے ہنس کر جواب دیا، 'جو کچھ تم نے کہا بہت بڑی حقیقت ہے۔ لیکن بہت کم لوگ تمھاری اس بات کو سمجھ سکیں گے۔'

اُس پہ سیلینیس مزید شوخ ہو گیا۔ 'کیا تم جانتے ہو کہ میرے ذہن خداوند کا کیا تصور ابھرتا ہے؟' وہ کہنے لگا۔ 'ہمارے علم سے کہیں زیادہ بڑھ کر ایک ایسی ہستی، جس نے کروڑوں کہکشائیں کائنات میں یوں پھیلا دیں ہوں، جیسے کوئی بڑی مچھلی اپنے انڈے بچے پورے سمندر میں پھیلا دے۔ لیکن وہ اس حقیقت سے نابلد ہو کہ ان سب کے ایک دوسرے سے میل ملاپ اور تصادم کے نتیجے میں پورے ماحول پر کیا اثر پڑ سکتا ہے۔ اور ہم انسان اس سب کے نتیجے میں شدید نقصان میں ہیں، اس لیے کہ یہ دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں، ہمارے نہیں بنائی گئی ہے، اور یہ ہمیں اب بھی قبول کرنے کو تیار نہیں ہے۔'

گرینڈین، جو اس کے خیالات کی شدت سے ایک عرصے سے واقف تھا، پوچھنے لگا، 'تو کیا تم سمجھتے ہو کہ انسان کے ذہن میں آنے والے کسی اچانک عمل کا نتیجہ ہوتے ہیں؟'

'ظاہر ہے۔ جیسے کچھ کیمیکلز کو ملانے سے یا کسی رگڑ کے نتیجے میں بجلی پیدا ہو جاتی ہے، ہمارا دماغ جو رگوں اور نسوں کا مجموعہ ہے اسی طور خیالات پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے۔

'لیکن یہ ثابت ہے کہ یہ دنیا جس میں ہم رہ

رہے ہیں، ہمارے نہیں بنی ہے۔ خیال، جو دماغ میں ظہور پذیر ہونے والے اچانک کسی ری ایکشن کے نتیجے میں پیدا ہوتا ہے، ناتواں اور منتشر حالت میں ہوتا ہے۔ اور یہ ہم دانشور لوگوں کو اس تصور سے کبھی چھٹکارا نہیں دلوا سکے گا کہ یہاں ہم اجنبی ہیں۔

'ذرا اس دنیا کو دیکھو۔ کیا اس میں پھیلے ہوئے جنگل اور صحرا یہ احساس نہیں دلاتے کہ یہ سب جانوروں کے لیے ہے؟ ہم انسانوں کے لیے یہاں کیا ہے؟ کچھ بھی تو نہیں ہے۔ اور جانوروں کے لیے سب کچھ ہے۔ وہ اپنی جبلت کے مطابق، سوائے شکار کرنے اور ایک دوسرے کو کھانے کے، کچھ بھی نہیں کرتے۔ خداوند نے یہاں صرف اپنی ان مخلوقات پہ دھیان رکھا جو ایک دوسرے کو نگلنے میں مصروف ہیں، لیکن وہ ہم انسانوں کی دانشوری کو پیشگی نہیں دیکھ سکا۔ کیا تم نہیں دیکھتے کہ کبوتر اور بٹیر وغیرہ عقابوں کا پیٹ بھرنے میں کام آتے ہیں۔ بہتر ہوتا کہ ہرنوں، بھیڑوں اور بیلوں وغیرہ کا گوشت سلاد وغیرہ کے ساتھ ہم انسانوں کے دسترخوانوں کی زینت بنتا۔ لیکن ان سب کا گوشت تو خنزیروں کا پیٹ بھرنے کے کام آتا ہے۔

'جہاں تک ہمارا تعلق ہے، تو جیسے جیسے ہم زیادہ تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ ہوتے جا رہے ہیں، ویسے ویسے اُن حیوانی خصلتوں کو جو خداوند نے اپنی مرضی سے ہمارے اندر رکھی ہیں، کم کرتے ہوئے اپنی ذہانت کے بل بوتے پہ ترقی کرتے جا رہے ہیں۔ ہم نے اپنے رہنے کے لیے مکان بنائے، مزے کے لیے لذیز کھانے جیسے میٹھا گوشت، اور پیسٹریاں وغیرہ، پہننے کے لیے کپڑے، لیٹنے کے لیے آرام دہ گدے اور بیڈ، اور سفر کے لیے ریلوے کو ایجاد کیا۔ ہم نے سائنسی علوم دریافت کیے، لطیف جذبوں کی آبیاری کے لیے شاعری لکھی۔

'اب ذرا اس تھیٹر پہ نظر ڈالو۔ کیا یہ صرف اور صرف ہماری عقل کا کارنامہ نہیں؟ کیا حیوانی جبلتیں رکھنے والا ابتدائی انسان یہ سب کر سکتا تھا؟

'اب ذرا اس عورت بیگم نواب کو دیکھو۔ خداوند کی مرضی تھی کہ یہ عریاں یا کسی جانور کی کھال میں خود کو لپیٹے کسی غار میں زندگی گذارتی۔ لیکن کیا اب وہ بہتر نہیں لگ رہی؟ تاہم اس کے غیر مہذب شوہر نے اس کے ساتھ کیسا برا سلوک کیا۔ یہی نا کہ اس سے سات بچے پیدا کرنے کے بعد کسی بری عورت کے پیچھے لگ گیا۔'

اُس پہ گرینڈین نے جواب دیا، 'اے میرے عزیز دوست، یہی وجہ ہے کہ نواب نے یہ دیکھ کر کہ اس کی بنائی ہوئی فیملی زیادہ بڑھ چکی ہے، اس نے انہی اصولوں پہ عمل کیا جو تم نے ایک فلاسفر ہونے کے ناتے ابھی

بیان کیے ہیں۔'
عین اسی وقت سٹیج کا پردہ اٹھا اور دونوں نے ہیٹ اتارتے ہوئے، مڑ کر اپنی نشستیں سنبھال لیں۔

(۴)

نواب اور بیگم نواب بگھی میں سوار ایک دوسرے سے بات کیے بغیر اپنے محل لوٹ رہے تھے۔
'گیبرائیل۔' نواب نے اچانک کہا۔
'تمھیں کیا چاہیے؟'
'کیا تم نہیں سمجھتی ہو کہ اب اس بات کو ایک لمبا عرصہ ہو چکا ہے۔'
'تو پھر؟'
'جس دہشت ناک سزا سے تم نے مجھے دو چار کر رکھا ہے، اسے سہتے اب چھ برس بیت چکے ہیں۔'
'تو میں کیا کروں۔۔۔ تم کیا چاہتے ہو؟'
'تم بتا دو بچوں میں سے وہ کونسا ہے۔'
'کبھی نہیں بتاؤں گی۔'
'ذرا سوچو کہ بچے میرے نزدیک ہوتے ہیں، لیکن میں انہیں پیار نہیں کر سکتا۔ تم مجھے بتا دو کہ ان میں سے وہ کونسا ہے۔ میں قسم اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں تمھیں معاف کر دوں گا اور اس کے ساتھ سب جیسا سلوک روا رکھوں گا۔'
'میں ایسا کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔'
'کیا تمھیں نظر نہیں آ رہا کہ اس قسم کی زندگی میں مزید برداشت نہیں کر سکتا؟ انہیں میں جب بھی دیکھتا ہوں، تو میں خود سے سوال کرتا ہوں کہ ان میں سے وہ کونسا ہے۔ یہ سوچ سوچ کر میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔'
'تو اس کا مطلب ہے کہ تمھیں کافی سزا مل چکی ہے۔'
'انتہائی تکلیف دہ حد تک۔ یہ جانتے ہوئے کہ ان میں سے ایک میرا نہیں ہے، تمھارے ساتھ رہنا اذیت ناک عمل ہے۔'
'تو تمھیں بہت سزا مل چکی ہے۔' بیگم نواب نے دہرایا۔
'ہاں،' نواب نے اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا۔ 'کیا میں نے تمھیں ہر روز نہیں بتایا کہ یہ میرے کس قدر اذیت ناک امر ہے؟ تمھارے خیال میں کیا مجھے تم سے اور بچوں سے محبت کیے بغیر اس گھر میں رہنا چاہیے؟ تم نے میرے ساتھ بہت زیادتی کا سلوک روا رکھا ہے۔ تم اچھی طرح جانتی ہو کہ میں نے بچوں پہ کتنی جان نچھاور کی ہے۔ میں نے پرانے زمانے کے لوگوں کی مانند ان سے محبت کی ہے۔ میں تمھارے ساتھ بھی پرانے وقتوں والے شوہروں کی طرح پیش آیا ہوں۔ ہاں، البتہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں تمھارے بارے میں حسد کا شکار ہو گیا تھا۔ اس لیے کہ میں پرانے زمانے کے لوگوں کی طرح ہوں۔ جبکہ تم ایک مختلف طرح کی خاتون ہو۔ یعنی ہم دونوں دو مختلف طرح کی دنیاؤں کے باشندے ہیں۔ اور ہاں، تم نے مجھ سے اُس

روز جو کچھ کہا تھا، وہ میں آج تک نہیں بھولا۔ لیکن اس کے بعد میں نے تم سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ میں نے تمھیں قتل نہیں کیا، اس وجہ سے کہ پھر میرے پاس یہ جاننے کا کوئی طریقہ نہ بچتا کہ ان بچوں میں سے کون میرا ہے اور کون نہیں ہے۔ میں نے بہت انتظار کیا۔ مگر کس قدر تکلیف برداشت کی، اسکا تم اندازہ کر ہی نہیں سکتیں۔ یہ سوچ کر کہ یہ میرا ہے بھی یا نہیں، میں ان میں سے کسی کو بھی اپنے پاس بلانے، اپنے گھٹنوں پہ بٹھانے اور پیار کرنے کے قابل نہیں رہا۔ لیکن ان چھ سالوں کے دوران میں نے تمھارے ساتھ اپنا رویہ درست رکھا۔ بلکہ میں تم پہ اور زیادہ مہربان ہو گیا۔ اب مجھے سچ بتا دو۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میں کسی قسم کی کوئی زیادتی نہیں کروں گا۔'

تبھی میں اندھیرا ہونے کے باوجود نواب کا خیال تھا کہ وہ اس بات کو محسوس کر سکے گا کہ وہ اس کی باتوں سے متاثر ہو گئی ہے۔ اور وہ کچھ نہ کچھ کہے گی۔ 'میں تمھاری منت کرتا ہوں، التجا کرتا ہوں کہ مجھے حقیقت بتا دو۔' نواب نے مزید کہا۔

'میں تمھاری نسبت کہیں زیادہ خود کو قصوار اور شرمندہ محسوس کر رہی ہوں،' بیگم نے کہا۔ 'بات یہ ہے کہ میں مسلسل ماں بنتے رہنے کے جھنجھٹ سے خود کو آزاد کرانے کی غرض سے تمھیں اپنے سے دور رکھنا چاہتی تھی۔ اس کے لیے میری سمجھ میں یہی طریقہ آیا۔ میں نے خداوند کے حضور بچوں کے سر کی قسم کھا کر جھوٹ بولا تھا۔ دراصل میں نے تمھارے ساتھ کبھی بے وفائی نہیں کی۔'

'کیا یہ سچ ہے؟'

'ہاں یہ سچ ہے۔'

لیکن دکھ کے ہاتھوں وحشی بن کر اس نے اس نے انتہائی تکلیف سے کہا، 'اب تم نے مجھے ایک نئے شک میں مبتلا کر دیا ہے۔ وہ یہ کہ کیا تم نے پہلے جھوٹ بولا تھا یا تم اب جھوٹ بول رہی ہو۔ اس طرح کی صورت حال کے بعد عورت پہ کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔ تمھیں صاف صاف بتا دینا چاہیے تھا کہ دن ہے یا رات ہے۔'

تبھی جب بیرونی صحن میں داخل ہو کر برآمدے کی سیڑیوں کے ساتھ آ کر رکی تو حسب معمول نواب پہلے اترا، پھر اس نے اپنا بازو بڑھا کر بیگم کو نیچے اتارا۔ پھر جیسے ہی وہ پہلی منزل پہ پہنچے تو نواب نے بیگم سے کہا، 'کیا میں تم سے کچھ دیر اور بات کر سکتا ہوں؟'

'ہاں، تم کر سکتے ہو۔'

وہ ایک ملحقہ چھوٹے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گئے۔ خدمت گار نے ہلکی سے حیرانگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کمرے کی شمعیں روشن کیں اور پھر جلد ہی وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے رخصت ہوتے ہی نواب نے جہاں بات چھوڑی تھی، وہیں سے شروع کرتے ہوئے کہا، 'میں نہیں جان پا رہا کہ سچ کیا ہے۔ میں نے تم سے ہزار مرتبہ پوچھا مگر تم تو گونگی بنی رہیں۔ تم

نے ذرا سی لچک اور نرم دلی نہیں دکھائی۔ اور آج تم کہہ رہی ہو کہ تم نے جھوٹ بولا تھا۔ چھ سال تک تم نے مجھے اپنی بات کا یقین دلائے رکھا۔ نہیں، تم اب جھوٹ بول رہی ہو۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں، یا شاید مجھ پر ترس کھا کر تم ایسا کر رہی ہو۔'

'اگر میں ایسا نہ کرتی تو ان آخری چھ سالوں میں تم مجھ سے چار بچے مزید پیدا کر چکے ہوتے۔' اس نے خلوص سے بھرپور لہجے میں جواب دیا۔

'کیا کوئی ماں ایسا کہہ سکتی ہے؟'

'اچھا' اُس نے جواب دیا۔ 'میں ان بچوں کے لیے، جنہیں میں پیدا نہیں کیا، کوئی متاسف نہیں کر سکتی۔ میرے لیے اُن بچوں ہی کی محبت کافی ہے، جنہیں میں نے پیدا کیا ہے۔ اور میں انہیں خلوصِ دل سے محبت کرتی ہوں۔ میں اعلیٰ اقدار رکھنے والی سوسائٹی کی عورت ہوں، میرے محترم۔ اور میرے جیسی سب ہی عورتیں اس دنیا میں بچوں کو ٹھونستی نہیں جائیں گی۔'

پھر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر نواب نے اسے بازو سے پکڑ لیا اور کہا۔ 'گیبرائیل، صرف ایک لفظ میں سچ بتا دو۔'

'میں نے تمھیں ابھی بتایا ہے کہ میں نے تمھاری عزت کو ہمیشہ مقدم رکھا ہے۔'

تب نواب نے اس کے پورے چہرے کو غور سے دیکھا اور محسوس کیا کہ وہ کتنی خوبصورت تھی۔ اس کی گرے آنکھیں اور سیاہ بال اس کے حسن میں دو چند اضافہ کر رہے تھے۔ پھر جیسے اسے الہام ہوا ہو، اور وہ ایک نئی حقیقت سے دوچار ہوا۔ اُس پہ کھلا کہ اس کے سامنے موجود عورت کا مقصدِ حیات صرف نسلِ انسانی کو مسلسل آگے بڑھائے چلے جانا نہیں۔ بلکہ ہماری اُن اعلیٰ اقدار کو آگے منتقل کرنا جو نسل کو آگے بڑھانے کے عمل میں نظر انداز ہو چکے تھے۔ اِس جیسی چند ہی عورتیں ہیں جو ہمارے لیے شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ کو جلا بخشنے کا باعث ہوتی ہیں۔ اور یوں ہماری تہذیب صحیح سمت میں آگے بڑھتی ہے۔

اب وہ اس عظیم حقیقت کے اس قدر دیر سے آشکار ہونے پہ اس کے سامنے حیران و پریشان کھڑا تھا۔ ماضی میں جاتے ہوئے اس نے جان لیا کہ یہ سب اس کے بیگم نواب سے حسد کی بنا پر تھا۔ تب اس نے کہا 'میں تمھارا اعتبار کرتا ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ تم اب جھوٹ نہیں بول رہی ہو۔ پہلے میرا خیال تھا کہ تم جھوٹ بول رہی ہو۔'

اُس پہ بیگم نے اپنا ہاتھ اسکے ہاتھ میں دیا اور کہا، 'تو پھر ہم دوست ہیں۔'

تب نواب نے اسکے ہاتھ پہ بوسہ دیا اور کہا، 'ہاں ہم دوست ہیں۔ بہت شکریہ گیبرائیل۔'

پھر وہ اس کی جانب دیکھتے اور یہ سوچتے ہوئے کہ وہ اب بھی کتنی خوبصورت ہے، باہر نکل گیا۔ اس دوران اس کے دل میں عجیب سے جذبات سر اُٹھانے لگے تھے۔

☆☆☆☆☆

کیا ہوا [خاکہ]

وہ اپنے بستر پر اوندھے منہ ترچھے رُخ ایسے پڑی تھیں جیسے کسی کو انہوں نے گلے لگایا ہو۔ دونوں بازو اپنے سینے سے باندھے وہ اس دنیا کو جوتی مار گئی تھیں۔ باجی دراصل نہایت عجیب اور منفرد عورتوں میں سے ایک تھیں۔ موت بھی اُنھیں ان کی حسب منشا ہی آئی۔

دروازہ توڑنے کی ضرورت اس لیے پڑی کہ وہ علی الصبح اُٹھنے کی عادی تھیں۔ نماز قرآن کے بعد انھوں نے اونچی آواز میں ریڈیو یا ٹی وی پر نعتیں سننے کو معمول بنا رکھا تھا۔ گھر کے آگے پیچھے کے برآمدوں کی بتیاں بجھانے تک وہ سورج کو رد کے رکھتیں تھیں۔

آج جب بلی سیڑھی اُتر کر نیچے آئی اُس نے پانی کی موٹر آن کرنا تھی جس کا پانی اس وقت تک اوپر نہ چڑھتا تھا، جب تک کہ نیچے کے باتھ روم کا ایک نلکا نہ کھولا جاتا آج اسے نیچے کے پورشن میں تن تنہا قیام پذیر اس کی امی کے معمولات میں فرق محسوس ہوا۔ اس نے دیکھا کہ پیچھے کے برآمدے کی لائٹ آن ہے - ان کا ڈرائینگ روم کی جانب کھلتا دروازہ جہاں وہ صبح اٹھ کر تقریباً ۱۲ بجے تک بیٹھتی تھیں ابھی تک بند ہے، بلی تب اور بھی حیران ہوئی جب اسے آواز سے علم ہوا کہ امی کے کمرے کا اے سی چل رہا ہے، وہ بھی صبح کے آٹھ بجے تک! زمین اس کے پیروں تلے سے ایکبار تو سرکی، اس نے دروازے کھٹکھٹائے، بار بار آوازیں دیں۔ امی، امی دروازہ کھولیں۔

بے حس و حرکت ماحول میں کوئی تبدیلی نہ آئی، وہ بھاگی بھاگی اوپر گئی، ''اویس امی دروازہ نہیں کھول رہیں، جلدی چلیں۔' 'چلیں نا چلیں نا'، اس نے سوئے ہوئے اویس کی قمیض پکڑ کر جھنجھوڑی۔

بلی فطرتاً ڈرپوک اور کمزور واقع ہوئی تھی۔ جلد گھبرا جانا اس کی حسیات میں شامل تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اویس نے بھی آکر دروازے کو پوری طاقت سے پیٹا لیکن دونوں کی آوازیں بھی دروازہ نہ کھلوا سکیں۔

دروازہ توڑنے کی نوبت آ جانے پر معلوم ہوا۔ باجی نہیں رہیں۔! اور یہ سانحہ رات کے کسی پہر خاموشی سے رونما ہوا۔ ابھی کل

رخشندہ نوید

شام بلی نے انھیں فرنٹ صحن میں بیٹھے دیکھا تھا۔ وہ خاص طور پر نیچے اُتری تھی اور امی کو سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ بہت گرمی ہے اندر چلی جائیں آپ کی طبیعت خراب نہ ہو جائے لیکن باجی نے حسب عادت اونچی آواز میں کہا تھا۔ نہیں سب ٹھیک ہے! تم چلو۔۔

رات کو وہ سوئیں اور سوتی ہی رہ گئیں۔ کسی کو نہیں معلوم۔ رات ان پر کیا بیتی۔ ہارٹ اٹیک، برین ہیمرج، نروس بریک ڈاؤن یا گرمی جس سے ان کا دم گھٹ گیا۔ ان کی موت پر آنے والوں نے جب ان کے کمرے کا اے سی لگایا تو دیکھا کہ یہ اے سی نہیں، ہیٹر ہے۔ اس میں گیس نہ جانے کب سے ختم ہو چکی تھی۔

باجی کے گھر کی متعدد چیزوں کی طرح یہ اے۔ سی بھی پچھلے ۴۰ برس سے اسی کھڑکی میں نصب ہے، جس کی عمریوں بھی پوری ہو چکی تھی۔ بلکہ اس گھر میں پڑا تمام سامان، فرنیچر، ڈیکوریشن کے بلی، کتے، فریم میں لگی سالہا سال پرانی تصاویر، شوکیس میں نہایت اعلیٰ کراکری، اسی حالت میں انھیں مقامات پر مدتوں سے دھری ہیں۔ باجی نے کسی کو کبھی اجازت نہ دی تھی کہ کوئی ان کے سسٹم میں مداخلت کر سکے۔

مرے بہنوئی یعنی باجی کے شوہر بھٹی صاحب لیبر انسپکٹر بھرتی ہوئے تو ان پر خدا کی خوب رحمت ہوئی۔ وحدت کالونی کے کوارٹرز میں بہت سے برس گزارنے کے بعد انھوں نے وحدت روڈ پر اپنا گھر بنالیا۔ دونوں بیٹیوں اور بھٹی صاحب کے ساتھ اس گھر میں باجی تقریباً ۴۰ سال رہیں۔ بھٹی صاحب شاید رشتے میں باجی کے دور نزدیک کے کزن تھے۔ باجی کو اکثر ان کی بڑی بہن آپی اور ان کی خالہ کہا کرتے تھے بچھی ایک بیٹا پیدا کرلو بڑھاپے کا سہارہ ہوتا ہے۔ لیکن باجی بڑی بری شکل بناتیں۔ یا پھر ہنس کر کہتیں۔ دفع کرو خالہ۔ مجھے تو بھٹی ویسے ہی برا لگتا ہے اس کے پاس جانا تو اور بھی۔ آخ تھو! بچھی باجی بہت سخت مزاج خاتون رہیں حتیٰ کہ اپنی دونوں بیٹیوں کے لیے بھی وہ بڑی پتھر دل ماں رہیں۔ دونوں بیٹیاں ان کی آنکھ کے اشارے کو سمجھتی تھیں۔ بچپن میں گھر میں پڑے بسکٹ اور نمکو جو صرف مہمانوں کے لیے پڑے ہوتے پتھر بن جاتے مگر انھیں کھانے کا حکم نہیں تھا۔ پوچھے بغیر کچھ بھی کھانا ان کے لیے ناممکن تھا۔

بچھی باجی کی تعزیت کے لیے آنے والے اکثر لوگ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ وہ اکیلی کیوں رہتی تھیں۔ ان کے شوہر بھٹی صاحب کہاں تھے۔ اگر ان کی بیٹی اوپر کے پورشن میں تھی تو ماں نے تکلیف کے وقت اس کو آواز کیوں نہ دی۔ اوپر والوں کو کیوں علم نہ ہو سکا کہ نیچے 47 درجے کی گرمی میں اے سی آگ پھینک رہا ہے اور کمرے کے سارے دروازے بند ہیں۔

بشرہ باجی سے میری آخری ملاقات میری

امی کے گھر تقریباً ڈیڑھ ہفتہ قبل ہوئی تھی میری امی جو ان کے ابو اور مرے ابو کی دوسری بیوی تھیں باجی ہمارے ابو کی پہلی بیوی کی چار اولادوں میں ایک تھیں یہ پہلی (مرحومہ) بیوی میری امی کی سب سے بڑی بہن تھیں یوں رشتہ میں مری امی ان کی سگی خالہ بھی تھیں۔ آخری ملاقات کے دن میں نے دیکھا کہ وہ پہلے سے زیادہ کمزور تھیں۔ لباس بھی معمولی تھا۔ پاؤں میں ربڑ کی ستر اسی روپے والی گھر کی جوتی تھی۔ جس کی تھوڑی سی ہیل ہوتی ہے۔ لال لپ اسٹک کی محض باقیات ہونٹوں پر پپڑی کی طرح جمی تھیں۔ آنکھیں سفید سفید سی تھیں۔ وہ کچھ عرصے سے سرمہ ٹائپ کچھ میک اپ استعمال کرتی تھیں لیکن اس روز ان کی آنکھیں اس سرمے سے عاری تھیں۔ زندگی کی اس سٹیج پر ان کے پاس ٹھیک ٹھاک بینک بیلنس تھا لیکن اس دن ان کا حلیہ غریب سی عورت جیسا لگ رہا تھا۔ صوفے پر بیٹھی ہوئی وہ مخبوط الحواس سی لگ رہی تھیں۔ باتوں میں بھی تھوڑا سا بہکا پن ظاہر ہو رہا تھا لیکن وہ اپنی دھن میں بولے جا رہی تھیں۔ اور روئے جا رہی تھیں۔ بالکل بچوں کی طرح منہ بنا بنا کر، پرس سے رومال بار بار نکال کر ہاتھ میں پکڑتیں اور بار بار آنکھیں پونچھتی تھیں ہر بات کے شروع اور آخر میں (ایمان سے) کہہ رہی تھیں جو کافی عرصے سے ان کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ ایمان سے خالہ اس بندے نے مجھے بڑی عیش کرائی ہے ساری زندگی --- وہ بہت نیک انسان ہے--- بھٹی صاحب کا ذکر ان کی ہر بات کا موضوع تھا۔ بات بھٹی صاحب سے شروع ہو رہی تھی ان پر ختم۔ خالہ جی ابھی ہفتے کو آئے تھے اوپر سے سیڑھیاں اُتر کر گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ بیلی مجھے آوازیں دے رہی تھی۔ امی جلدی آئیں۔ ابو جا رہے ہیں۔ آ کر مل لیں۔ میں نکل کر باہر مین گیٹ پر آئی، ہاتھ میں بریف کیس پکڑے بھٹی صاحب ہمیشہ جیسے شاندار اور حسین لگ رہے تھے۔ بڑا اعلیٰ لباس تھا۔ خالہ میں نے انھیں دیکھ کر دور سے اپنے بازو پھلا دیئے۔ بڑے عرصے بعد میں 5 منٹ تک ان کے گلے لگی رہی۔ باجی روتے روتے اس ملاقات کی روداد سنائے جا رہی تھیں۔ ان کا رنگ سیاہ سے سیاہ تر ہوتا جا رہا تھا۔ اس وقت میں نے دیکھا وہ بھٹی صاحب کا نام لے کر اتنی تکلیف محسوس کر رہی تھیں جتنی کوئی سینے میں خنجر اتارے تو ہوتی ہو۔ ہر آنسو کے ساتھ ایک گہری ہائے ان کے مونہہ سے نکلتی خالہ وہ بولے جا رہی تھیں خالہ جی ایمان سے آج بھی میری الماری نوٹوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر مہینے کی پہلی کو آٹھ دس ہزار روپیہ مجھے بھیجتے ہیں۔ خالہ خدا میری زندگی میں مجھے اس کا دکھ کبھی نہ دکھائے۔ میں اس سے پہلے مروں۔ بڑی شاندار موت آئے مجھے۔ کسی کو پتہ بھی نہ

چلے۔ کوئی مجھے ہاتھ نہ لگائے۔ میں کسی کی محتاج نہ بنوں۔ خالہ اس بیلی سے تو میں کبھی مدد نہیں لینا چاہتی۔ خدا میری موت خاموشی کی موت بنائے۔ کسی کو کانوں کان خبر نہ لگے سب پوچھتے ہی رہ جائیں آخر ہوا کیا۔ (ایمان سے) کہہ کر وہ دائیں طرف سر کو ہلا رہی تھیں۔ دیکھا جائے تو وہ کئی سال سے زندگی کے آخری سال گزار رہی تھیں۔ انھوں نے کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے سنی جاتیں ایمان سے اس زندگی میں بڑا سکون ہے بڑا مزہ ہے۔ میں نے اپنے اللہ سے لو لگائی ہوئی ہے۔ میں کبھی ایک ہزار سے کم کی تسبیح ورد نہیں کرتی۔ دن بھر میں پورا پنج سورہ اور نہ جانے کتنے سپارے پڑھ لیتی ہوں۔

نہ کوئی جھنجھٹ ہے۔ صاف ستھرا گھر وہ اپنے گھر میں اپنی دونوں بیٹیوں بیلی اور نازی کے بچوں کی موجودگی بھی اس باعث ناپسند کرتیں کہ وہ ان کے سامان اور پرانے قرینے سے سجی چیزوں میں خلل پیدا کرتے ہیں۔ چھوٹی بیٹی نازی کو پھر بھی کچھ رعایت حاصل تھی لیکن بیلی کے بچے تو باجی کے گھر پھٹک بھی نہیں سکتے تھے حالانکہ شادی کے کچھ سال بعد وہ باجی یعنی اپنی امی کے اوپر کے پورشن میں شفٹ ہو گئی تھی لیکن بیلی سے ان کا رشتہ آہستہ آہستہ ماں بیٹی کا نہیں بلکہ ساس بہو سے بھی بدتر ہوتا چلا گیا آخری چند سالوں میں تو بیلی نے خوب بددعائیں بھی لیں اور بدنامی بھی اٹھائی۔ لگتا یوں تھا جیسے ان کا بیلی سے Personality Clash تھا۔ باجی بھی کافی اکھڑ مزاج تھیں اور ان کی بیٹی بیلی بھی کچھ کم نہیں تھی ان کی ہی بیٹی تھی اس کے خون میں بھی ہٹ دھرمی بدرجہ اتم پائی جاتی تھی۔ باجی اکثر گھر میں گالم گلوچ کرنے لگتیں وقت کے ساتھ باجی کا غصہ حد سے بڑھا اور وہ بیلی اور اس کے بچوں کو قطعاً برداشت نہ کرنے کے موڈ میں رہنے لگیں۔ ایکبار ذرا بڑے لیول کا فساد کھڑا ہوا تو بیلی ڈر گئی اور ایسی بدظن ہوئی کہ سال بھر اس نے بھی باجی کا حال چال نہ پوچھا۔ نہ ہی یہ سوچا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ دیوار سے دیوار جڑے گھر کی ہمسائی نے اس جھگڑے کا خوب فائدہ اٹھایا۔ باجی سے خوب پیسے اینٹھے۔ باجی کے گھر اوپر کے پورشن میں شفٹ ہونے کے کئی سال تک تو بیلی اوپر سے کھانا باجی کے لئے ٹرے لگا کر تین ٹائم نیچے بھیجتی رہی لیکن باجی کے عجیب وغریب مزاج کے باعث یہ سلسلہ برے انجام پر ختم ہوا اور پھر ایک مدت تک ان کے ساتھ کے گھر والی عورت ان سے دو روٹی اور سالن کے بدلے بہت بڑی رقم مہینہ وار لیتی رہی باجی بیلی کے گھر سے آئے کھانے میں سو کیڑے نکالا کرتیں، کبھی کھانا پھینک دیا کرتیں۔ میں باجی کو دیکھ کر ان کے بارے میں سن کر بہت حیرت میں رہتی تھی کہ باجی کیسی ہیں۔ ان کے اندر

اتنی کڑواہٹ کہاں سے عود کر آئی۔
مجھے وہ زمانہ بھی یاد ہے جب بلی اور میں ہم عمر ہونے کی وجہ سے گہری سہیلیاں تھیں۔ ہماری امی یعنی ابو کی دوسری بیوی اور پہلی بیوی کے بچوں کی عمر میں بہت فاصلہ نہ تھا۔ سوادھر ہماری امی بچے پیدا کر رہی تھیں ادھر ان کے شوہر کی پہلی بیوی کے بڑے بچے -- میرا چھوٹا بھائی اور مرے بڑے بھائی جان کے بیٹے کی عمر برابر ہے میں اور بلی تقریباً ہم عمر تھیں - بچپن میں باجی کے گھر وحدت روڈ پر گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے میں اکثر جایا کرتی تھی مجھے تو اس کی اجازت مل جایا کرتی تھی لیکن بلی کو ہمارے گھر یعنی اپنے نانا جان کے گھر آ کر رہنے اور مجھ سے دوستی بڑھانے کے لئے باجی کی منتیں کرنا پڑتیں اور رو رو کر دکھانا ہوتا۔ اس زمانے کے باجی کے ہاتھ کے پکے چٹخارے دار کھانے مجھے آج بھی یاد ہیں۔ بھٹی صاحب کھانے پینے کے معاملے میں اعلیٰ ذوق کے مالک تھے۔ کریلے، بھنڈی اور آلو گوشت کا ذائقہ دار شوربا جو مصالحہ گوشت ہی ہوتا تھا میری زبان کو اکثر یاد آتا ہے۔ لیکن دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے باجی اور بھٹی صاحب کی کسی معمولی بات پر لڑائی شروع ہو جایا کرتی تھی۔ تو تو، میں میں، اور پھر جھگڑا طول پکڑ جاتا تھا۔ بلی نازی سہم جایا کرتی تھیں اپنی امی کو سمجھانے کی ان معصوم بچیوں کی کیا مجال تھی۔ بھٹی صاحب اکثر مجھے مخاطب کر کے میری باجی کی شکایتیں مجھ سے کیا کرتے تھے۔ اکثر مجھے ثالثی بنا کر رائے مانگتے کہ بتاؤ یہ غلط ہے یا درست اور میں اپنی ننھی سی عقل سے سوچتی رہ جاتی تھی - کہ ان دونوں میں کون قصوروار ہے۔

بھٹی صاحب کہتے کہ تیری باجی کے مزاج میں وہی بے جی والی ہوڑ ماریاں ہیں جو اس کے دماغ میں آ جائے وہ اس نے چھوڑنا کہاں ہے" بھٹی صاحب اکثر یہ ڈائیلاگ بولا کرتے تھے۔ بے جی یعنی ہماری نانی جنھوں نے بچھی باجی کو پالا تھا۔ کیونکہ بچھی باجی کے ساتھ ان کا جڑواں بھائی بھی پیدا ہوا تھا۔ دو بچوں کی وجہ سے بے جی یعنی ہماری نانی بچھی باجی کو اپنے گھر لے گئیں اور شادی تک وہ بے جی کے ساتھ ہی رہیں - وحدت کالونی کی رہائش کے زمانے میں باجی کے گھر باہر کے ممالک سے مہمان آیا کرتے تھے یہ مہمان بھٹی صاحب کے دوست اور ان کی کبھی کبھار فیملی بھی ہوتیں جن کی بڑی خاطر مدارت ہوتی۔ بھٹی صاحب دراصل بہت رکھ رکھاؤ والے انسان تھے وہ خود بھی اکیلے بارہا انگلینڈ کی سیر پر جاتے اور اپنے دوستوں کے گھروں میں رہتے سو بدلے میں وہ بھی انہیں اپنے گھر رکھا کرتے یہ مہمان وہی ہوتے جو ان کی مدارات انگلینڈ میں کرتے۔ اس فیملی کی۔ ایک خاتون کا ذکر کر کے باجی کڑھا بھی

کرتیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ان کے لیے نت نئے کھانے پکتے، تحفوں کا تبادلہ ہوتا۔ بھٹی صاحب انگریز ٹائپ انسان تھے۔ بڑے Civilized، نزاکت سے جینے کے عادی۔ وہ انگریزی میڈیم ٹائپ کے مردوں اور عورتوں کی کمپنی میں رہ کر اپنا Status high رکھا کرتے جبکہ باجی کہتیں میں تو جب بھی گئی حج پر جاؤں گی مجھے تو انگلینڈ جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ خدا اور محمدؐ کی محبت ان کے دل میں پرانی تھی۔ اس محبت پر انھوں نے اپنی شادی شدہ زندگی بڑی جاہلیت سے قربان کر دی۔ خدا سے اتنا ڈرنے والی باجی جانے اپنے شوہر سے کبھی ڈری کہ نہیں! وہ خدا کی محبت میں شوہر کی قدرتی محبت کو اس حد تک ترجیح دینے لگیں کہ بھٹی صاحب آخر ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔

ہماری نانی یعنی بے جی ہی باجی کی ماں تھیں۔ چھوٹے بڑے، ملا کر ہم گیارہ بہن بھائی ہیں۔ میرے والد میری امی سے شادی ہونے سے پہلے میری سب سے بڑی خالہ کے شوہر تھے۔ ان کے اس خالہ سے چار بچے ہوئے۔ آخری اولاد جڑواں بیٹی اور بیٹا تھے یہ بچھی باجی تھیں۔ جنھیں ان کی نانی، بے جی نے پرورش کیا۔ نانی نے انھیں بڑے لاڈ اور پیار سے پالا لیکن اپنی من مانی کرنا، اکھڑپن، اور انا پرستی جیسی خصوصیات بھی کوٹ کوٹ کر بھر دیں۔ بڑی خالہ کی وفات کے بعد ہماری امی جو سب سے چھوٹی بہن تھیں اور ابو سے 30 سال چھوٹی تھیں، قربانی کا بکرا بنیں۔ انھیں شادی کے تحفے میں خود سے دو چار برس چھوٹے بچے ملے۔

باجی کو میں نے ابو سے شکایت کرتے سنا تھا کہ اباجی آپ نے میرے ساتھ زیادتی کی۔ پہلے خود سے الگ کر دیا۔ مجھے باقی سارے بچوں کی طرح تعلیم بھی نہیں دلوائی۔ بھٹی صاحب سے نہایت کم عمری میں بیاہی جانے والی باجی کو شوہر رکھنے کا سلیقہ آخری عمر تک نہ آیا۔ وہ شوقین مزاج، پڑھے لکھے، سوٹ بوٹ میں رہنے والے مرد تھے۔ انگریزی بولنے والی عورتوں کے شیدائی۔ باجی شکل وصورت اور لباس میں نہایت گریس فل ہونے کے باوجود ذہنی ہم آہنگی پیدا کرنے کی صلاحیت سے یا تو محروم تھیں یا انھوں نے جان بوجھ کر خود کو مرد پر برتر ظاہر کرنے کے لیے کبھی کم ہی حالات سے سمجھوتہ کیا۔ مجھے یاد ہے بہت برس پہلے بھی کئی بار یہ معاملہ طلاق تک جا پہنچا کرتا تھا۔ لیکن ابو اور بھائی جان وغیرہ کبھی بندوق کے زور پر اور کبھی سمجھا بجھا کے معاملہ رفع دفع کروا دیا کرتے۔

دونوں بیٹیوں کے بیاہ کے بعد، ان بیٹیوں کے بڑے بڑے بچوں کے بعد بچوں کے نانا یعنی بھٹی صاحب نے اسلام آباد میں ایک ادھیڑ عمر، نہایت پڑھی لکھی اور تہذیب یافتہ عورت سے شادی کر لی۔ دراصل بھٹی صاحب ریٹائرمنٹ کے بعد اسلام آباد

پرائیویٹ نوکری کے سلسلے میں گئے تھے۔ وہ چونکہ لاء بیرسٹر بھی تھے اس لیے کسی فرم نے انھیں لیگل ایڈوائزر رکھ لیا تھا۔

سنا ہے انھوں نے کوشش کی تھی کہ باجی ان کے ساتھ اسلام آباد چلیں لیکن باجی نے حسب عادت انکار کر دیا کہ وہ اپنا گھر نہیں چھوڑیں گی۔ ان کا اب اس عمر میں ایسی زندگی سے گزارہ کرنے کا ارادہ نہیں تھا جہاں وہ کھانے پکاتیں اور ان کے چونچلے اٹھاتیں۔ یوں بھی باجی ہمیشہ سے بھٹی صاحب کی شوقین مزاجی کے تقاضے پورے کرنے سے بھاگتی تھیں۔

عین جوانی میں بھی وہ بھٹی صاحب کی رات کے وقت دی جانے والی آواز اور ڈیمانڈ پر تھوتھو کرتیں کہ یہ کیا بکواس ہے۔ شاید وہ بہت خشک مزاج تھیں۔ ان میں نرم خواہشات کی کمی تھیں شوہر کے قریب جانے کو اپنے لیے مصیبت جانتی تھیں۔ دراصل ان کے پیچے لگنا، کسی بھی حالت میں ان کے ذہن نے قبول نہیں کیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، شازی کے ساتھ چھٹیاں گزارنے اس کے گھر جب آیا کرتی تو میں اتنی چھوٹی بھی نہ تھی۔ رات کو باجی اور بھٹی صاحب کے بیڈ روم میں کھینچا تانی کی آوازیں خوب سمجھا کرتی تھی۔

بھٹی صاحب نے ان حالات کے بعد ادھیڑ عمری میں اسلام آباد جا کر دوسری شادی کر لی ان کے شادی کرتے ہی باجی مظلوم مشہور ہو گئیں بس وہ دن اور آج کا دن وہ اپنے گھر میں اکیلی رہ رہی تھیں۔

بلی شادی کے چند برس بعد ان کے اوپر کے پورشن میں شفٹ ہو گئی کیونکہ اس کے سسرال کے آبائی گھر میں اتنی ہی جگہ موجود تھی کہ ایک وقت میں ایک Couple وہاں رہتا۔ اگلی شادی تک پہلے جوڑے کو اپنے لیے دوسری جگہ کا بندوبست کرنا اُس چھوٹے گھر کی مجبوری تھا۔ بلی کے بعد اس کے سسرال میں ہونے والی اگلی شادی اس کی بہن نازی اور اس کے سب سے چھوٹے دیور عمران کی ہوئی یعنی وہ دیورانیاں جیٹھانیاں بن گئیں۔ بلی کے ساتھ باجی کے روابط نہ جانے کیوں نبھ نہ سکے۔ بھٹی صاحب سے تو چلو مانا کچھ اختلافات تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے قطعاً مختلف تھے، تھے۔ لیکن اپنی بیٹی بلی اور اس کے بچوں سے بھی جھگڑے چلتے رہنے کی وجوہات کی سمجھ نہیں آئی۔ شازی کے بیٹے طاہر نے بھی بیسیوں بار ان کے کمرے سے نکل جانے کا حکم سنا تھا تو معمول سے بڑھ کر سنگین گالیاں ان کا معمول بن چکا تھا۔ تنگ آ کر بلی اور ڈاکٹر اویس نے طاہر سے کہا کہ تم باجی کے سامنے مت جایا کرو۔ وہ تمھیں دیکھ کر غصہ کھاتی ہیں۔ اب تو طاہر باہر کے دیس پڑھنے چلا گیا ہے اور اس کی بہن رابعہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ماسٹرز کرنے چل دی ہے۔ 15

سالہ سحر بجلی کی سب سے چھوٹی بیٹی ہے وہ بھی باجی کی نگاہوں میں اپنا مقام بنانے میں ناکام رہی اور وہ بھی باجی کی نظروں سے گر گئی۔ نازی شادی کے کرشن نگر کے چھوٹے سے گھر میں رہ رہی تھی۔ اس کے بھی تین بچے تھے۔

باجی کی نازی سے دوستی شاید بجلی سے دوستی نہ ہونے کا ردعمل تھی یا پھر یہ کہ نازی دور تھی، وہ باجی کی ہاں میں ہاں ملاتی تھی۔ نازی کی بھی بجلی سے بہنوں والی بہت گہری دوستی نہ تھی۔ شادی سے قبل بھی وہ بجلی کی جاسوسی کیا کرتی اور خبریں باجی کو دیا کرتی تھی۔

لیکن مزے کی بات ہے نازی کے بچے عزیز ہونے کے باوجود باجی سے اتنی لبرٹی نہ لے سکتے تھے کہ باجی کے گھر میں کسی چیز کو اپنی مرضی سے ادھر ادھر کر سکیں۔ صوفے کے کور خراب ہونے پر ڈانٹ کے ساتھ ساتھ باجی کے تھپڑ بھی پڑ جایا کرتا اسی لیے۔ وہ بہت خوشی سے باجی کے گھر آنے پر رضا مندانہ ہوتے تھے۔

باجی کو انڈیپنڈنٹ زندگی کی ایسی عادت پڑی کہ نازی کی بھرپور کوششوں کے باوجود اسے باجی نے نیچے کے گھر یعنی اپنے ساتھ شفٹ ہونے کی اجازت نہ دی بلکہ دو بار تو اسے بری طرح خراب بھی کیا۔ وہ ادھر سامان باندھ لیتی۔ کرشن نگر سے فرار اور باجی کو کمپنی دینے کا جواز اس کے کام نہ آتا۔ کیونکہ آخری وقت پر باجی کو یہ یاد آ جاتا کہ نازی کے بچے گھر میں شور کریں گے اور گند مچائیں گے۔

وہ بجلی کے مقابلے میں نازی کو نوازنا تو چاہتیں تھیں۔ بجلی نے دراصل اوپر کے پورشن کو بڑے شائستہ انداز میں سجا کر کچھ نئی کنسٹرکشن کے بعد ایک مکمل پورشن بنا لیا تھا جبکہ نازی کرشن نگر کے پرانے، چھوٹے سے گھر میں تقریباً مشکل سے گزارا کر رہی تھی۔ چونکہ وہ آخری کپل تھا اس لیے وہ کہیں اور شفٹ نہیں کر سکے! نازی یوں بھی فطرتاً تھوڑی سی حاسد تھی۔ اسے لگتا کہ شازی کے گھر میں اتنا کچھ ہے۔ پورا ڈرائنگ، ڈائننگ، بیڈ روم وغیرہ۔ میرے بچے ان تمام چیزوں سے محروم ہیں۔ پھڈا کروا کے اس نے بھٹی صاحب سے باقاعدہ اس گھر پر دونوں بہنوں کے نام کی مہریں لگوا لیں تھیں۔ اب وہ چاہتی تھی نیچے کے پورشن میں شفٹ ہو کر قابض بھی ہو۔ لیکن باجی نے اسے اپنی زندگی میں ایسے موقع سے فائدہ اُٹھانے کا موقع نہ دیا۔ بلکہ بھٹی صاحب کی دوسری بیوی جب ایک موذی مرض سے چل بسی تو انھوں نے خواہش کی کہ وہ گھر واپس آ جائیں حالانکہ ان کی بیوی نے اسلام آباد میں نہایت خوبصورت اور فیشن ایبل گھر ترتیب دے رکھا تھا۔ بچہ پیدا کرنے کی اس کی عمر نہ تھی جبکہ بھٹی صاحب 65 برس کے ہو کر بھی کسی صورت بوڑھے نہ لگتے تھے۔ اپنی

اسلام آباد والی بیوی کے مرنے کے بعد بھٹی صاحب اپنا سامان اُٹھا کر لاہور اپنے گھر آ گئے۔ شاید چند دن رہے بھی، لیکن بھٹی صاحب کو باجی نے ٹکنے نہ دیا یہی کہا کرتیں اس عمر میں شوہر کے نخرے برداشت نہیں کر سکتیں۔ میں اللہ اللہ کرتی ہوں۔ میں کھانے نہیں پکا سکتی۔ وہی بھٹی صاحب کا کھنچاؤ اور باجی کا تناؤ۔ بیٹیاں سمجھاتی رہ گئیں اور ایک بار پھر وہ اس گھر میں اکیلی رہ گئیں۔ اب کے بھٹی صاحب کو اپنی بیٹیوں کی عمر کی افغانی عورت نے پھنسا لیا اور اس حسین و جمیل دوشیزہ نے ایک نہایت امیر، سمارٹ، ہینڈسم، بوڑھے شخص کو جوان کر کے نہ صرف شادی کی بلکہ یک خوبصورت بیٹے کا جنم بھی ہو گیا۔

بلی کو ہم چھیڑا کرتے تھے کہ تیرے منے بھائی کا کیا حال ہے؟ باجی بلی کے اس لیے بھی زیادہ خلاف تھیں کہ بلی بھٹی صاحب کی سائیڈ لیتی تھی۔ وہ امی کے رویے کو غلط سمجھتی اور بھٹی صاحب کی شادی وغیرہ کو بھی اس نے بہت زیادہ مائنڈ نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے بچے نانا کو اکثر عیاش نانا کے نام سے یاد کرتے تھے اور وہ بھی اپنی امی کو اس کے چھوٹے بھائی کے ذکر سے چھیڑتے اور طعنے دیتے۔ نازی کو اکثر گلہ رہتا کہ نانا کی ساری مراعات خاص طور پر مالی مراعات بلی کے بچے جھپٹ لیتے ہیں کیونکہ ابو آ کر اس کے گھر میں اوپر بھی کبھا رر رہتے ہیں۔ اکثر بھٹی صاحب باجی سے ملے بغیر ہی لاہور کا دورہ کر کے رخصت ہو جایا کرتے۔ دو تین دن سے زیادہ اب کبھی شاذ ہی رہے تھے۔ ہفتے کی رات کو آئے۔ اتوار کی رات کو چلے گئے۔ بلی ان کے لیے اچھے اچھے کھانے بناتی۔ وہ اس کے بچوں کو اکثر لبرٹی مارکیٹ سے کپڑوں وغیرہ کی شاپنگ کرواتے نازی کے لیے یہ بات قابل برداشت نہ تھی۔ بھٹی صاحب کو یوں بھی لاہور آنے کی ضرورت ہی کہاں تھی۔ ایک حسینہ کا پہلو چھوڑ کر آنا۔ ایک بہت ہی پیارے چھوٹے سے بچے سے دوری۔ اب ان کے بس میں تھا ہی کہاں؟ ان کی بیٹیاں اپنے ابو سے ناراض ہی رہتی کہ ابو کو اب ہماری ذرا پرواہ نہیں رہی۔

بھٹی صاحب کو کرشن نگر جانا بہت پسند نہیں تھا کیونکہ وہ سائل کے مارے ہوئے انسان ہیں۔ انھیں پرانے گھر کے پرانے آرکیٹکٹ سے الجھن ہوتی۔ نازی منتیں کرتی رہ جاتی۔ اکثر فون پر رد بھی پڑتی۔ باجی سے اب ضروری نہ تھا کہ بھٹی صاحب کی ہر بار ملاقات ہو۔ اپنی ساری اکڑ پھوں کے باوجود باجی کمزور ہوتی جا رہی تھیں۔ لباس میں وہ طمطراق موجود نہیں تھا لیکن باتوں میں وہی جھوٹی انا..... جس میں خود کو بہت سکھی گروانتے چلے جانا شامل تھا۔ لیکن کون نہیں جانتا تھا کہ ان کی زندگی بھی کوئی زندگی ہے، اندر ہی اندر گھل کر وہ ختم ہو گئیں۔ آخری ایک دو سالوں میں خاندان کے دو ایک گھروں میں جا کر وہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتیں۔ شاید انھیں کبھی

اندازہ نہیں ہو سکا کہ دنیا کچھ لو کچھ دو کا نام ہے۔ بلی کے بچے بھی پیار کی زبان ہی سمجھتے ہیں۔ آج کے اس دور میں گالی کون سنتا ہے۔ بلی کے ساتھ ان کا تقریباً شریکہ چل نکلا تھا۔ اکثر کہتیں میں نے بہلو سے کبھی کچھ مانگا ہے میرے گھر میں سب کچھ ہے۔ پھر میں کیوں پرواہ کروں۔

لیکن آخر میں باجی اپنے فیصلوں پر جعلی اور نقلی طریقوں سے پردے ڈالتی تھک سی گئیں تھیں۔ لیکن ان کا نخرہ اور انا قائم تھی۔ اپنی کسی بھی غلطی کو انھوں نے آخری وقت تک تسلیم نہیں کیا۔ خدا تعالیٰ کی ذات کو دن کے ایک تہائی حصے تک بھی یاد کر لیا جائے تو باقی دن کے لمبے پینڈے اور پوری رات آخر وہ کیا کرتی ہوں گی۔ اوپر میڑھی چڑھے انھیں برسوں گزر گئے تھے۔ نازی ہفتے دس دن میں آتی۔ فون اکثر خراب رہتا۔ دولت الماریوں میں بند دھر کر جانے انھیں کیا ملا۔ یا تو وہ خود پر کھلے دل سے خرچ کر لیتیں، نوکر رکھتیں۔ فون، موبائل، اپنی سہولت اور آسانی پر صرف کرنا بھی شاید ان کے اصولوں میں نہیں تھا۔ یوں تو اکیلا رہ کر کیا کھانا پکانا۔ نازی کے آنے پر کھانا پکایا کرتیں۔ اب کھانا زیادہ ہضم بھی نہیں ہوتا تھا۔ اس بے باورچی خانے کا خرچہ بھی کچھ نہ تھا۔ اندر اندر سے اس تنہائی اور قید تنہائی سے تنگ آ چکی تھیں لیکن یہی کہتی تھیں میں نے اللہ سے یاری کر رکھی ہے۔ مجھے خواب میں جانے کیا کیا دکھائی دیتا ہے۔ خدا کا رستہ پاک رستہ ہے۔ اپنے اصولوں پر زندہ رہنے کا ریکارڈ بنا کر گئیں۔ انھوں نے زیست کو اپنی بندی بنا کر جیا۔ جیسا جی چاہا وہی کیا لیکن آخر انسان تھیں چند برس سے اس گھٹ گھٹ کر جینے، چپ رہنے، اکیلے رہنے کے باعث اپنی بات کسی سے نہ کہہ سکنے کے باعث شدید ڈپریشن کا شکار ہو گئیں تھیں۔ کچھ عرصہ پہلے وہ وقت آیا جب سب نے سمجھا ان کا آخری وقت آ گیا کیونکہ اتنی زیادہ کمزور ہو گئیں کہ بستر سے لگ گئیں تھیں۔ رنگ سیاہ پڑ گیا۔ ایک دو فیشن جو وہ ہمیشہ کرتی تھیں یعنی بال کالے کرنا، اور آئی برو پلک کرنا ان کو نبھانے کی بھی طاقت نہ رہی۔ لیکن اپنی قوت ارادی سے پھر اچھی بھلی ہو گئیں۔ صحن کے فرش پھر سے خود دھونے شروع کر دیئے۔

دراصل کام والیوں کو ویسے بھی اچھوت تصور کرتی تھیں۔ اور ان سے سخت الرجک تھیں۔ اب محلے کی کوئی کام والی کام پکڑنے کو تیار نہ ہوتی۔ خود ہی تھوڑا تھوڑا کر کے گھر کا کام کرتی رہتیں تھیں! یوں بھی انھیں اپنی صحت پر بھروسہ تھا۔ اسی لیے اتنی بہادر تھیں۔ بہادری سے تمام عمر اکیلے گزار دی۔ معلوم نہیں انھیں رات کو خوف کیوں نہیں آتا تھا۔ گھر کے دروازے، کنڈیاں چڑھاتیں اور سو جاتیں۔ لیکن ہو نہیں سکتا کہ رات کو اٹھنے والی خوف اور وحشت کی آوازیں ان کے کانوں تک نہ پہنچتی ہوں۔

میری آنکھوں میں اکثر اس زمانے کی باجی آتی ہیں جب وہ نازی بلی کے ساتھ ہمارے گھر آیا کرتی تھیں۔ نہایت شوخ رنگوں کے لباس، سونے میں لدی ہوئی۔ لال رنگ کی لپ اسٹک

ان کا خاصا تھی۔ اونچی ہیل کی جوتی، پرس ہاتھ میں لٹکائے وہ ٹک ٹک کرتی آتیں۔ نہایت فریش اور حسین عورت کے روپ میں، ناک پر مکھی نہ بٹھانے والی عورت..... ابو..... سے بڑی خوش ہو ہو کر باتیں کیا کرتیں تھیں۔ ابو بھی انھیں خوب چڑھایا کرتے، بڑا پیار اور تپاک دکھاتے۔ خوب خاطر کرتے۔ انھیں لیڈی صاحبہ کہہ کر مخاطب کرتے۔ انھیں مشورے دیتے، وہ بھی اباجی اباجی کہہ کر خوب قصے سنایا کرتیں۔

اب آخری عمر میں انھوں نے جو چند باتیں یاد رکھی، یا اکثر دھراتیں اس میں اباجی کی چند نصیحتیں بھی وہ اکثر یاد کرتیں۔ کوئی انھیں اپنے گھر چلنے کو کہتا جیسا کہ وہ میری امی کے گھر 'جوان کی خالہ' تھیں۔ یوں تو ان کے اباجی کی چھوٹی بیوی تھیں لیکن بڑے بچے انھیں خالہ ہی کہتے۔ خالہ سے آخری عمر تک ان کی دوستی رہی۔ خالہ کے گھر آنا جانا انھوں نے کبھی پوری طرح نہیں چھوڑا۔ رکشہ میں بیٹھ کر سال میں دو تین بار ضرور آجایا کرتیں اور اگر انھیں سب کہتے کہ رات رہ جائیں تو کہتیں..... خالہ (میرے اباجی جو 10 سال پہلے رخصت ہو چکے ہیں) کی نصیحت ہے، "ایمان سے" انھوں نے کہا تھا کہ بشرہ بیگم رات کسی کے گھر نہیں رہنا..... رات کو اپنے گھر واپس جا کر آرام سے سویا کرو..... نہیں خالہ میں رات کہیں نہیں رہ سکتی۔ اور واقع وہ بھٹی صاحب کے چلے جانے کے بعد تمام عمر ایک رات کہیں نہیں رہیں۔ باجی کی بڑی بہن آپی کے بچوں کی شادی پچھلے برس ہوئیں۔ تو باجی نے بھرپور حصہ لیا۔ سٹیج پر ناچنے کی باری آئی تو باجی اپنی لگن اور مستی میں دیوانوں کی طرح ٹھمکے لگاتی چلی گئیں۔ مجبوراً ان کی مخبوط الحواسی کی سی حالت دیکھ کر نازی کو سٹیج پر آ کر پہلے تو ان کے ساتھ تھوڑی دیر ناچنا پڑا پھر گھیر کر انھیں نیچے لے جانا پڑا۔ باجی لاکھ جگر رے والی خاتون تھیں ان کے شوہر کی شادی کی خبریں ملتیں جس پر وہ کبھی غصے اور جلال میں بھی آجاتیں۔ لیکن ان کے بلند حوصلہ ہونے کے باوجود انھیں بھٹی صاحب کے بیٹے کی خبر نہیں کسی نے تادیر نہیں سنائی۔ بلی نازی کے خیال میں یہ بات شاید وہ برداشت نہ کر سکتیں۔

انھوں نے کبھی کم ہی ان کی بیویوں کا ذکر کیا تھا۔ ایک بار سنا تھا پہلی والی بیوی جسے بلی آنٹی کہتی تھی باجی ان کے پاس اسلام آباد جا پہنچی تھیں۔ اسے اس کے منہ پر برا بھلا کہہ کر آئی تھیں۔ لیکن باجی کو کبھی ایسی چھوٹی باتوں میں ہم نے ملوث نہیں پایا کہ وہ سوچیں کہ بھٹی صاحب امیر آدمی ہیں۔ اس مکان کے ساتھ ساتھ اور جو بھی کچھ ان کے پاس ہے وہ ان کی دوسری بیوی نے اپنے نام کروالیا ہوگا۔ ان کی اسلام آباد کی جائیداد پر وہ دوسری بیوی قابض ہے۔ جبکہ بلی نازی کثر اس حساب کتاب میں غرقاب ہوتی تھیں کہ ایک افغان عورت نے ابو کا سب کچھ لے لیا ہے۔

ہوسکتا ہے باجی سوچتی تو بہت کچھ ہوں اپنی

اس زندگی کے بے ترتیب کتابچے کے بارے میں جس پر جو لکھا انھوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا۔ وہ ایک معمہ عورت رہیں جن کی موت بھی ایک معمہ ہے۔ وہ آخری ملاقات میں امی کے گھر کہہ رہی تھیں، خالہ جب میں چلی جاؤں گی۔ تو سب پوچھتے رہ جائیں گے۔ آخر کیا ہوا۔ یہ ہوا کیا ہے؟

آج ان کی میت پر روتی ہوئی چنگھاڑتی ہوئی بلی اور سسکیاں بھرتی ہوئی نازی دونوں کو تسلی ہے۔ باجی ان کے لیے اس مکان کے علاوہ 50 تولے سے زائد سونا، پانچ سات لاکھ روپیہ چھوڑ کر گئی ہیں۔ بلی کے رونے میں وہ شدت نہیں ہے جو نازی کے رونے میں ہے۔ آخری چند سال سے نازی ان کی تقریباً سیکرٹری بن گئی تھی اور یوں بانٹ ہو گئی تھی کہ بھٹی صاحب بلی کے اور نازی امی کی! دونوں بچے بٹ گئے تھے۔

بھٹی صاحب کو شازی نے صبح ہی روتے روتے فون کیا۔ ابو امی ہمیں چھوڑ گئیں ہیں۔' انھوں نے تسلی سے جواب دیا۔ میں اپنی گاڑی پر اس وقت پشاور کے راستے میں ہوں۔ میں پہلے پنڈی جاؤں گا، وہاں سے ڈائیو پر لاہور پہنچوں گا دو تین بجے تک۔ پھر اس کے بعد انھوں نے کسی کا فون نہ سنا پہلے جنازے کا اعلان وقت عصر طے ہوا۔ پھر بھٹی صاحب کے لیے مغرب تک بڑھا دیا بیٹیاں تڑپتی رہ گئیں کہ ابو آئیں گے۔ لیکن دونوں داماد جو اندر سے بھٹی صاحب کے رویے سے کچھ اتنا خوش بھی نہیں تھے اور باجی کے اور مرے بڑے بھائی جان جو بھٹی صاحب کے سخت خلاف تھے، سب نے مغرب سے پہلے چارپائی اُٹھالی۔ بلی امی کے ساتھ ابو ابو بھی کرتی رہ گئی۔

باجی کی سوئے شہر خموشاں روانگی کے کافی دیر بعد پتہ چلا کہ شاید بھٹی صاحب پہنچ گئے ہیں۔ نماز جنازہ کے کچھ پہلے اویس نے پھر بھٹی صاحب کو فون کیا، تو انھوں نے کہا کہ وہ راوی روڈ کے قریب ہیں۔ You go on! اور باجی نے بھٹی صاحب کو منہ دکھائے بغیر ہی زیر زمین جانا پسند کیا۔

قتل کے دن میں نے بھٹی صاحب کو گھیر لیا، یوں تو میں اُن کی بیٹی بلی کی ہم عمر تھی۔ باقی بہت سے قریبی لوگ مجھ سے بڑے تھے مگر وہ سب خاموش تھے۔ کسی نے بھٹی صاحب سے زیادہ بات نہ کی۔ میں نے بہت سی باتوں کے بعد انھیں کہا کہ کیا آپ جانتے ہیں سب آپ کو قاتل مان رہے ہیں۔ مگر انھوں نے میری بہت سی باتیں سن کر پروں پر پانی نہ پڑنے دیا۔ اور وہ قتل کے فوراً بعد اسلام آباد روانگی کے لیے گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے بولے دراصل She was your part میں تم لوگوں کا حصہ نہیں ہوں شاید اس لیے! پہلی جمعرات پر بلی کے بقول بھٹی صاحب فون پر کہہ رہے تھے، تمھاری ماں مجھے چاروں طرف کھڑی ہو کر گھورتی رہتی ہے!

☆☆☆☆☆

امی جان [خاکہ]

ماں پر قلم اٹھانے کے لیے بڑا دل و گردہ چاہیے اس لیے اکثر نے اپنی ماں پر خاکے نہیں لکھے۔ حالانکہ ماں ایک ایسی ہستی ہے جس کے ساتھ انسان سارا بچپن، لڑکپن، جوانی اور بعض مرتبہ بڑھاپا بھی گزارتا ہے اور انسان کے پاس لکھنے کو بہت سا مواد ہوتا ہے۔ لیکن شاید خاکے لکھنے کے لیے جو بے باکی اور برجستگی چاہیے وہ ماں جیسے رشتے کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔ اس لیے اگر خاکہ لکھا بھی جائے تو اس میں تقدس کا پہلو زیادہ واضح نظر آتا ہے لیکن ایک کوشش بلکہ جرأت ہم بھی کر رہے ہیں۔ شاید ہم بھی دوسروں کی طرح ناکام ٹھہریں، پر ہمارا محبت نامہ قبول ہو جائے۔

ہم نے تمام عمر امی جان کو کام کرتے دیکھا ہے۔ ماشاء اللہ ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ ان میں ہم سب سے بڑے ہیں۔ ابا جان کو بچوں کا بہت زیادہ شوق تھا۔ اکثر وہ فرمایا کرتے تھے کہ وہ بچوں کی کرکٹ ٹیم بنائیں گے۔ والدہ ماجدہ ان کی اس بات سے بڑا گھبراتی تھیں اور خاندانی منصوبہ بندی پر سختی سے عمل کرتیں لیکن پھر بھی ہر سال بچے کی آمد ایک معمول تھا۔ آخر تنگ آ کر آپ نے آٹھویں بچے کی پیدائش پر آپریشن کرا لیا تاکہ ''نہ ہوگا بانس نہ بجے گی بانسری''۔ ہمیں قوی یقین ہے کہ اگر والدہ ماجدہ آپریشن نہ کرواتیں تو والد صاحب ضرور کرکٹ ٹیم اکٹھی کر لیتے۔

امی جان کی ہمیشہ یہی خواہش رہی کہ ان کے بچے پڑھ لکھ جائیں۔ اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ ہر بچے کی منت بھی کرتیں اور زبردستی بھی۔ ہمارے منجھلے بھائی جن کا تعلیم کی طرف بالکل رجحان نہیں تھا، ان کو بھی آپ نے میٹرک کروا دی۔ حالانکہ وہ ہمیشہ اپنے پرچے صاف صاف دے کر آتے تھے کیونکہ لکھنے سے صفحے میلے ہو جاتے تھے۔

آپ مطالعہ کی شوقین ہیں اور ہم نے ہمیشہ آپ کو خواتین رسائل، ناولز اور قرآن مجید کی تلاوت کرتے دیکھا۔ ان کے مطالعے کے شوق کی وجہ سے ہمارے اندر بھی مطالعہ کا شوق پیدا ہوا اور ہم نے عمرو عیار کی کہانیاں اور عمران سیریز پڑھنا شروع کی اور آج بہت سا الٹا سیدھا لکھ رہے ہیں کیونکہ بہت کچھ الٹا سیدھا پڑھا، ''جو آپ نے دیا وہی آپ کو لوٹا رہے ہیں''۔ آپ نے والد صاحب کے سامنے ہمیشہ بچوں کی

محمد کلیم

تعلیم کے حق میں بولا اور تمام بچوں کی تعلیم پر زور دیا۔ ہم نے ان سے اردو بولنا سیکھی حالانکہ ہماری مادری زبان سرائیکی ہے لیکن والدین نے ہمیں اردو بولنا سکھائی جبکہ ہمارے والدین آپس میں سرائیکی میں بات کرتے تھے اور ہم سے اردو میں کلام کرتے تھے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ہم گلابی اردو بولنے لگے جس میں سرائیکی کے الفاظ اور لہجہ شامل ہے۔ مثال کے طور پر ہم آج تک اردو کو اڑدو، پردہ کو پڑدہ، الماری کو الماڑی کہتے چلے آرہے ہیں۔

ہم نے آج تک والدہ ماجدہ کو غصہ میں نہیں دیکھا۔ جب دیکھا ان کو شفیق اور نرم خو پایا۔ والد صاحب غصہ کے تیز تھے لیکن آپ ان کے سامنے نہیں بولتی تھیں۔ خاص طور پر بچوں کے سامنے آپ نے والد صاحب کو پلٹ کر جواب کبھی نہ دیا اور ہمیں بھی تلقین کی کہ اپنے ابو کی عزت کرو۔

ہم مشترکہ خاندانی نظام میں رہتے تھے جہاں ایک طرف ہماری دادی اور دو چچا رہتے تھے، درمیان میں ایک وسیع صحن تھا اور صحن کی دوسری طرف ہمارا حصہ تھا جس میں دو کمرے، ایک سٹور اور ایک چھوٹا سا باورچی خانہ تھا۔ باورچی خانے میں چولہا نیچے لگا ہوتا تھا۔ امی جان پیڑھی پر بیٹھ کر باورچی خانہ میں کام کرتی تھیں۔ شام کو روٹی جب آپ بناتیں تو سارے بچے آپ کے گرد اکٹھے ہو جاتے اور آپ توے سے گرم گرم روٹی اتارتی جاتیں، ہم کھاتے جاتے۔ ہر روز اس بات پر بحث ہوتی کہ کون پہلی روٹی لے گا۔ ہر بچے کی خواہش ہوتی کہ پہلی روٹی اُس کو دی جائے لیکن والدہ اپنی مرضی سے روٹی تقسیم کرتیں تاکہ جھگڑا نہ ہو اور ہم بھی وہیں باورچی خانے میں پیڑھی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے۔ دیکھنے والے کہتے ہیں کہ مرغی اپنے چوزے پروں میں دے کر ان کو دانہ کھلا رہی ہے۔ ہمیں یاد نہیں کہ ہم کو کبھی کھانا دیر سے ملا ہو یا ہم بھوکے سوئے ہوں۔ جب ہم یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو ہماری یونیورسٹی کی بس (روٹ) صبح پونے سات بجے لینے پہنچ جاتا اور اگر آپ لیٹ ہوں تو روٹ چھوٹ جاتا تو یونیورسٹی جانے میں بڑی مشکل ہوتی۔ لیکن اتنی صبح سویرے روٹ آنے کے باوجود آج تک ہم کبھی بھی بھوکے یونیورسٹی نہیں گئے۔ ان کو ہم سے زیادہ ہمارے کھانے کی فکر ہوتی کہ کہیں بچہ بھوکا نہ چلا جائے اور ہم دو سال میں کبھی بھی بھوکے یونیورسٹی نہیں گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب پی ٹی وی عروج پر تھا اور ہم پورا خاندان رات آٹھ بجے اکٹھے بیٹھ کر ڈرامہ دیکھتے تھے اور اگر غلطی سے اس وقت والد صاحب آجاتے تو اس بات پر ناراض ہوتے کہ سارے بچے کیوں والدہ کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر بیٹھ کر ڈرامہ دیکھ رہے ہیں۔ اور ہم ابا جی کو دیکھ کر مختلف کونے کھدروں میں چھپ جاتے اور ڈرامہ دیکھنا بھول جاتے لیکن آٹھ بجے والا ڈرامہ ہمارا

پسندیدہ مشغلہ ہوتا اور ہر قسط کا انتظار کیا جاتا اور اس پر سیر حاصل گفتگو کی جاتی اور آنے والی قسط کی پیشن گوئی بھی کی جاتی کہ اب آگے کیا ہوگا اور اس تمام بحث کے اندر والدہ صاحبہ کی باتوں کو سب پر اوّلیت حاصل رہتی اور وہ اس گفتگو میں بھرپور حصہ لیتیں۔ ایک عادت جو انہوں نے سکھائی وہ اب تک ہمارا ساتھ دے رہی ہے۔ جب بھی ہم کوئی چیز بازار سے اپنے لیے خرید کر لاتے تھے تو وہ اس میں سے ضرور تھوڑا سا حصہ اپنے لیے رکھ لیتی تھیں۔ بعض مرتبہ ہمیں غصہ بھی آتا تھا کہ ہماری ہر شے میں سے حصہ لے لیتی ہیں۔ اگر ہم غصے کا اظہار کرتے تو وہ سمجھاتیں ''بیٹا! اس طرح تمہیں اپنی شے بانٹنے کی عادت ہوگی جو تمام عمر تمہارے کام آئے گی''۔ ہمیں لگتا ہے کہ ہم نے اپنی شے کیوں بانٹنی ہے، اس کا ہمیں کیا فائدہ ہے؟ لیکن آج محسوس ہوتا ہے کہ ایک چھوٹی سی عادت سے ہم نے کیا کچھ سیکھ لیا۔ انہوں نے کبھی بھی بیٹی اور بیٹے میں فرق نہیں کیا۔ ہمیشہ دونوں کو اپنی آنکھ کا تارا بنا کر رکھا۔ بلکہ اپنے بیٹوں کو سکھایا کہ وہ اپنی بہنوں کا خیال رکھیں اور ان کو پرایا نہ سمجھیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ باوجود اختلاف رائے کے ہمارے گھر میں ہم تمام بہن بھائی اکٹھے ہو کر چلتے ہیں۔ امید واثق ہے آگے بھی چلتے رہیں گے۔

ہمارے والد صاحب کی وفات صرف ترپن سال کی عمر میں ہوگئی تھی لیکن والدہ صاحبہ نے والد صاحب کی وفات کا غم ہمیں محسوس نہیں ہونے دیا۔ کبھی ہم نے ان کو روتے، آنسو بہاتے نہیں دیکھا بلکہ اللہ کی رضا سمجھ کر اس کو قبول کیا۔ لیکن والد صاحب کے ایصال ثواب کے لیے ہر سال ہمارے ہاں برسی ضرور منائی جاتی ہے۔ ہم کو ہمیشہ اعتراض ہوتا ہے کہ ہم برسی کیوں مناتے ہیں، کیا ہم والد صاحب کو بھول گئے ہیں۔ لیکن امی جان کہتی ہیں ''بھول نہیں گئے لیکن یاد بھی تو نہیں کرتے، چلو اسی بہانے ہم ان کو یاد کر بیٹھتے ہیں۔'' بات ان کی ٹھیک ہے۔

امی جان کا قد درمیانہ، رنگ صاف، جسم بھاری اور چہرہ ہلکی سی مسکراہٹ لیے ہوئے ہوتا ہے اور لب ہمیشہ ہلتے نظر آتے ہیں۔ شاید وہ ورد کرتی رہتی ہیں، اللہ کو یاد کرتی ہیں۔ شوگر، بلڈ پریشر کی مریضہ ہیں لیکن بیماری کو کبھی روگ نہیں بنایا، دوائی مستقل استعمال کرتی ہیں، پرہیز بھی کرتی ہیں لیکن ان کو رات کو نیند جلد نہیں آتی۔ حالانکہ اکثر رات کو سونے کی دوائی بھی استعمال کرتی ہیں۔ اس کا حل انھوں نے موبائل پر یوٹیوب میں نکالا ہے۔ آج کل ''ہم ٹی وی'' دیکھ کر دل کو بہلاتی رہتی ہیں۔ ہماری دعا ہے کہ ان کا سایہ ہم پر تا دم قیامت قائم رہے اور ہم ان کی مسکراہٹ کو یوں ہی دیکھتے رہیں اور ان سے دعائیں وصول کرتے رہیں۔

☆☆☆☆☆

غزل

رنگ کہتے ہیں کہانی میری
کس کی خوشبو تھی جوانی میری

کوئی پائے تو مجھے کیا پائے
کھوئے رہنا ہے نشانی میری

کوہ سے دشت میں لے آئی ہے
دشمنِ جاں ہے روانی میری

کِھل رہی ہے پسِ دیوارِ زماں
خواہشِ نقلِ مکانی میری

سرِ مرقد ہیں سبھی سایہ کشا
کوئی حسرت نہیں فانی میری

تپشِ رنگ جھلس ڈالے گی
کیا کرے سوختہ جانی میری

نقش تھا میں بھی کِسی تختی کا
اڑ گئی خاکِ معانی میری

کیا سخن فہم نظر تھی جس نے
بات کوئی بھی نہ مانی میری

ناقدوں نے مجھے پرکھا خالد
خاک صحراؤں نے چھانی میری

خالد احمد

غزل

کچھ دن تو یہی سماں رہے گا
پھر شہرِ الم دھواں رہے گا

دیوانے نے چھوڑ دی ہے بستی
سوچا بھی ہے اب کہاں رہے گا

بتلائے کوئی زمیں کے اوپر
کب تک یہی آسماں رہے گا

مٹ جائیں گی سب کی سب دلیلیں
ہونے کا مگر گماں رہے گا

جیسا بھی ہو رنگِ بے قراری
اک شخص قرارِ جاں رہے گا

جانکاہ سے فاصلوں کے باوصف
دیکھ آئیں گے تو جہاں رہے گا

صحرا کے نشاں یہی ہیں مجنوں
ناقد ہے تو ساربان رہے گا

سحر انصاری

غزل

ایسے بھرے جہاں میں اکیلا ہوا کوئی
اس کے بغیر جینا بھی جینا ہوا کوئی

اندر کا حال کھول کے دیکھا کرے گا کون
جب آہنی دراز کا بستہ ہوا کوئی

کیسے چھڑا کے ہاتھ وہ آگے چلا گیا
پھرتا ہے اب تلاش میں بچھڑا ہوا کوئی

کوئی چراغ بجھنے لگے قہقہے کے ساتھ
جلتا ہے آہِ سرد سے بجھتا ہوا کوئی

مجھ کو وضاحتوں کے لیے لفظ چاہیے
انجان بن گیا ہے جو سمجھا ہوا کوئی

بھولے ہوئے خیال کی شدت کو یاد کر
تو بھیج مجھ کو شعر بھلایا ہوا کوئی

ثاقبؔ ہوا کے ساتھ میں آہیں مچل گئیں
کرتا ہے مجھ کو یاد جو بھولا ہوا کوئی

آصف ثاقب

غزلِ مسلسل

مانا کہ دیر ایک سی حالت نہیں رہی
پر کیا کریں کہ صبر کی طاقت نہیں رہی

کچھ بھی نہیں تھا پاس تو رہتے تھے جب بھی خوش
اور اب کسی بھی چیز میں لذت نہیں رہی

چھاتا نہیں ہے ذہن پر وہ وصل ہو کہ ہجر
شاید لہو کی آگ میں شدت نہیں رہی

دنیا کے تو حساب سے ہم کامیاب ہیں
البتہ خود سے ملنے کی فرصت نہیں رہی

ہم کیوں زمیں کا بوجھ بنے تم کو اس سے کیا
تم پر تو بے وفائی کی تہمت نہیں رہی

ق

اہلِ یقیں گمان کے رستوں میں کھو گئے
اہلِ نظر کے پاس بصیرت نہیں رہی

اب اُن کے بام و در میں نہیں روشنی کا نام
وہ جن کے دم سے دہر میں ظلمت نہیں رہی

اُڑتے ہیں خشک پتوں کی صورت وہ لوگ اب
جن کو کبھی بہار سے فرصت نہیں رہی

اک کوہسارِ کبر ہے جس کو بھی دیکھیے
عظمت کی بات اب کہیں "خدمت" نہیں رہی

دنیا میں ڈوب کر نہ کرے جو عطا کا شکر
دیکھا کہ اُس کے بخت میں برکت نہیں رہی

کس طرح روک پائیں گے تاروں کی گردشیں
وہ جن کو اپنے آپ پہ قدرت نہیں رہی

جو بھی ہے رنگ و لطف وہ جاگے ہوؤں کا ہے
سوئے ہوؤں کے ساتھ تو قسمت نہیں رہی

کہنے کو لوگ کرتے ہیں تاروں سے گفتگو
آپس میں بات چیت کی عادت نہیں رہی

گو جانتے ہیں دور کے سیّارگاں کا حال
پر اپنے اردگرد سے نسبت نہیں رہی

سمجھا ہے جب سے "وقتِ مقرر" کا فلسفہ
اب اپنے صبح و شام میں عجلت نہیں رہی

اچھے رہے جو جی گئے فطرت کے ساتھ ساتھ
خود تو کسی کے ساتھ بھی فطرت نہیں رہی

کیسی بھی تیز دھوپ ہو ہوتی ہے رزقِ شام
پھر اس کا کیا ملال کہ شہرت نہیں رہی

دنیا بھی اب رہی نہیں ویسی نظر نواز
دل میں بھی اب وہ آگ، وہ وحشت نہیں رہی

عظمت، عروج، تخت تو سب تھے ہی عارضی
پر وہ جو اپنے نام کی عزت نہیں رہی

یہ کس جہاں میں عمرِ رواں لے چلی ہمیں
منظر میں رنگ، آنکھ میں حیرت نہیں رہی

ان رہبروں نے کر دیا اس درجہ بے یقیں
اپنی کسی کے ہاتھ پہ بیعت نہیں رہی

ماں باپ ہی کے دم سے تھے سارے معاملے
ہاتھوں کا زور، پاؤں کی جنت نہیں رہی

جس سے خریدا جا سکے قسمت کا فیصلہ
ہرگز کسی کے پاس وہ دولت نہیں رہی

ہر ہر قدم پہ دیتی رہی زندگی سبق
عبرت کی بات یہ ہے کہ عبرت نہیں رہی

ریگِ روانِ وقت میں بھٹکے ہیں اس قدر
اُمید کی تو چھوڑیے، حسرت نہیں رہی

جونہی ہلا وہ تخت تو پھر دوسرے ہی پل
در پر غلام، راہوں میں خلقت نہیں رہی

جتنے بھی دعویدار تھے، جتنے تھے مدّعی
سب رہ گئے صرف ''محبت'' نہیں رہی

ڈھلتے ہی عمر رکنے لگا کاروانِ شوق
دل کو کسی بھی چیز سے رغبت نہیں رہی

جاں داد گانِ راہِ محبت کا شکریہ
اگلی سی اب وہ ظلم کی دہشت نہیں رہی

فرہاد ہی کے ساتھ گئی رسمِ جوئے شیر
مجنوں کے بعد دشت میں وحشت نہیں رہی

اُس بے وفا کی چپ نے کیا خود ہی آشکار
ہم کو بیانِ درد کی حاجت نہیں رہی

حرفِ غلط مثال وہ کٹتا چلا گیا
جس کے بھی قول و فعل میں وحدت نہیں رہی

جاری ہے اب بھی چاروں طرف رقصِ موت کا
جو سُرخرو کرے وہ شہادت نہیں رہی

اے کاروانِ درد! بہت تھک گئے ہیں ہم
اب اور مسکرانے کی ہمّت نہیں رہی

امجد نشاطِ غم کا مزا تم بھی جانتے
''افسوس تم کو میر سے صحبت نہیں رہی''

امجد اسلام امجد

غزل

یہ جو شہروں میں بہت نام کمائے ہوئے ہیں
کسی قصبے سے کسی گاؤں سے آئے ہوئے ہیں

کیا جتائیں کہ ترے عشق میں ہم نے کیا کیا
دن بجھائے ہوئے ہیں درد جگائے ہوئے ہیں

اک تو رکھا ہے زمانے نے نشانے پہ ہمیں
اور اپنے بھی ہدف ہم کو بنائے ہوئے ہیں

یہ کسی نصرتِ غیبی کا کرشمہ ہی تو ہے
وہ کہ جو راہ کی دیوار تھے سائے ہوئے ہیں

اصل کچھ بھی کہیں بنیاد میں موجود نہیں
آپ بے وجہ مگر بات بڑھائے ہوئے ہیں

جینے جینے میں ہے کیا فرق یہ خود ہی دیکھیں
آپ ڈھائے ہوئے ہم آس بندھائے ہوئے ہیں

اِس سے بڑھ کر کوئی ہونے کی گواہی کیا ہو
خود کو احساس کی سُولی پہ چڑھائے ہوئے ہیں

جلیل عالی

غزل

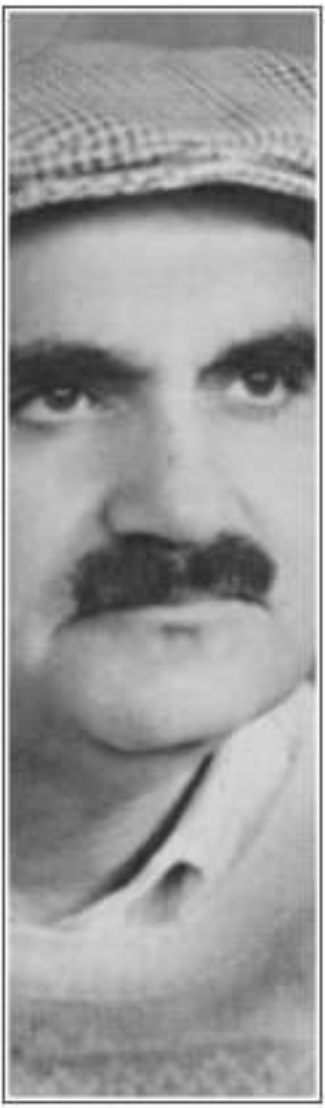

شوخیٔ بندِ قبا ہے ، کہ مجھے ہوش نہیں
تابشِ رنگ حنا ہے کہ مجھے ہوش نہیں

ساقیا! کس نے کہا ہے کہ مجھے ہوش نہیں
ہوش میں کون رہا ہے کہ مجھے ہوش نہیں

سامنے تیرا ہی آنچل ہے، کہ دل پاگل ہے
تُو ہی آغوش کشا ہے ، کہ مجھے ہوش نہیں

جب بھی دیکھا ہے، تری مست نگاہوں کی طرف
مجھ کو محسوس ہوا ہے کہ مجھے ہوش نہیں

کوئی دیکھے تو وہ جادو بھرا پیکر ، وہ غزال
سب کو مجھ سے ہی گلہ ہے کہ مجھے ہوش نہیں

جس کے ہونٹوں کی حلاوت نے مجھے مست کیا
وہ بھی اب مجھ سے خفا ہے کہ مجھے ہوش نہیں

اُس کے چہرے پہ کرن رقص کناں دیکھی ہے
میری نظروں کی خطا ہے، کہ مجھے ہوش نہیں

جب کبھی سامنے آئی ہے وہ خورشید جمال
میرا یہ حال ہُوا ہے کہ مجھے ہوش نہیں

ہوش کا مجھ پہ یہ الزام بھی باقی نہ رہے
مجھ کو اتنا تو پتہ ہے کہ مجھے ہوش نہیں

جمیل یوسف

غزل

ذرا سی دیر میں کیا ہو گیا نہیں معلوم
کوئی کمی سی ہے لیکن ہے کیا نہیں معلوم

طرح طرح کی حکایت سُنی ہے دُنیا سے
مگر کسی کو بھی تیرا پتا نہیں معلوم

مہک رہا ہے ترے گیسوؤں کا لالہ زار
کہاں بھٹکتی ہے بادِ صبا نہیں معلوم

کھڑا ہوں منزلِ مقصود پر اکیلا میں
کہاں ہوا ہوں کسی سے جُدا نہیں معلوم

رقیب اپنا سمجھتے ہیں مہر و ماہ مجھے
گُریز کرتا ہے کیوں آئنہ نہیں معلوم

گزر رہا ہوں کسی بے چراغ کوچے سے
جلو میں کون ہے اپنے سوا نہیں معلوم

کہا کہ کوئی ٹھکانا بھی ہے کہیں تیرا؟
کہیں قریب سے آئی صدا: "نہیں معلوم"

گزشتہ رات صبا نے ترا پتا پُوچھا
میں جانتا تھا مگر کہہ دیا "نہیں معلوم"

اُسے ہے میرے شب و روز کی خبر ساجد
مرا جو حال ہے کس کو بھلا نہیں معلوم

غلام حسین ساجد

غزل

جب آئے گا اک مرحلہ گفتار سے آگے
تب طرزِ عمل دیکھیں گے کردار سے آگے

ہم آئینہ ہیں، عکس ہیں یا آئینہ گر ہیں
کچھ اور تقاضا بھی ہے دیدار سے آگے

کشتی بھی شکستہ سی ہے دریا بھی چڑھا ہے
دریا ہی نظر آیا ہے اس پار سے آگے

ممکن ہے کوئی دشتِ بلاخیز ہو پھر بھی
کیا ہو گا بھلا وادیٔ پُرخار سے آگے

ہم شہرِ خرابات میں جائیں گے کسی روز
آثار نظر آئیں گے آثار سے آگے

دن ڈھلنے لگا اور تو دیکھا نہیں کچھ بھی
سایہ ہی نظر آیا ہے دیوار سے آگے

کچھ ایسے مسائل بھی ہیں جو حل نہیں ہوتے
لب بستگی اب رہ گئی انکار سے آگے

تاریخ بتاتی ہے ہمیں اردو ادب کی
اک سلسلۂ نثر ہے اشعار سے آگے

کھلتا نہیں ہر چند حسنؔ ہم نے بھی سوچا
کیا صورتِ اظہار ہے اقرار سے آگے

حسن عسکری کاظمی

غزل

جب برہمی کا ذائقہ پانی میں آئے گا
دریا دوبارہ اپنی روانی میں آئے گا

منشا سمجھ لیا ہے ہواؤں نے اب مرا
اب لطف کچھ پیام رسانی میں آئے گا

جی بھر کے جب کہ دیکھ لئے منظرِ فنا
کون اب دوبارہ عالمِ فانی میں آئے گا

عکسِ جمالِ یار بھی اِک روز ، دیکھنا
خوشبو بنے گا، رات کی رانی میں آئے گا

وُہ جس نے مجھ کو ایک کہانی بنا دیا
ہرگز نہ اس کا نام کہانی میں آئے گا

لکھ دیں گے اپنا نام ہم اِس کائنات پر
یوں بھی دوام لمحۂ فانی میں آئے گا

جس نے رہائی پائی، اُسے بھی یہ خوف ہے
بارِ دِگر وُہ قیدِ زمانی میں آئے گا

تجھ سے جدائیوں کے نتیجے میں ایک روز
کیسا جنوں ترے خفقانی میں آئے گا!

تحریر ہو گی پیاس کی اِک اَور داستاں
جتنا لہو فرات کے پانی میں آئے گا

دیوانہ ہو نہ جائے کہیں چودھویں کا چاند
جب اُس کا عکس جھیل کے پانی میں آئے گا

اب جسم تھک چکا ہے تو اُمید ہے نسیم
ٹھہراؤ شوقِ نقل مکانی میں آئے گا

نسیمِ سحر

غزل

گلاب فصلِ خزاں سے نکال لائے ہو
کہاں کی چیز کہاں سے نکال لائے ہو

دکھا کے شوخیٔ عکسِ جمالِ شہرِ سخن
بلاء کے شورِ سگاں سے نکال لائے ہو

یہ میں نہیں ہوں سرِ آئینہ مرے دن رات
کسے زمان و مکاں سے نکال لائے ہو

میں جس گھڑی کو فراموش کرنا چاہتا تھا
اسے بھی وہم و گماں سے نکال لائے ہو

جلا کے راکھ نہ کر دیکھیں خدا نہ کرے
جو برق اشکِ رواں سے نکال لائے ہو

کبھی دہن سے برستے تھے پھول ہر جانب
یہ تیر کس کی کماں سے نکال لائے ہو

یہی بہت ہے محبت بھری نظر سے مجھے
جہانِ سود و زیاں سے نکال لائے ہو

ہزار شکر دلوں میں بسا دیا اس کو
خدا کو شہرِ بتاں سے نکال لائے ہو

یہ واقعہ ہے کہ پھولوں کی آرزو میں کنور
چمن کو عہدِ خزاں سے نکال لائے ہو

اعجاز کنور راجہ

غزلیں

وہی مہکتے تھے جو دامنِ دعا میں پڑے
کبھی کے سوکھ چکے پھول وہ ہَوا میں پڑے

یہ کیا کہ خود سے تغافل کی انتہا کر دی
وہ مرحلے دلِ عاشق پہ ابتدا میں پڑے

حضورِ شوق کھُلا ایک بھی نہ رازِ سخن
عجیب پیچ مِرے حرفِ مدعا میں پڑے

جنہوں نے شور مچایا ہمارے ہونے پر
اُنھی پہ سنگِ صدا شہرِ بے صدا میں پڑے

ہمیں ہی جلدی تھی کارِ حیات میں لیکن
ہمارے کام ہی اب تک ہیں التوا میں پڑے

یہی ہے زاہدوں اور شاہدوں کا کفارہ
بتوں کو کوستے ہیں خانۂ خدا میں پڑے

خاور اعجاز

چھٹی نہیں دُکان سے ہفتے میں ایک دن
کیسے مِلیں جہان سے ہفتے میں ایک دن

خُود سے بھی گفتگو نہیں کرتا ہُوں صبح تک
سوتا ہُوں ایسی شان سے ہفتے میں ایک دن

سُنتا نہیں وہ بات مِری سات روز تک
کہتا تو ہے زبان سے: ہفتے میں ایک دن

خاورؔ سکوں ہو تم کو بھی، دیوار و در کو بھی
نکلا کرو مکان سے ہفتے میں ایک دن

غزل

اور جا کر کہیں کرتا ہے سحر شام کے بعد
ختم ہوتا نہیں سورج کا سفر شام کے بعد

توڑ دیتی ہیں خموشی کو چہکتی چڑیاں
بولنے لگتے ہیں چپ چاپ شجر شام کے بعد

اُس کو خورشید نظر تک نہیں آنے دیتا
مرکزِ دید ٹھہرتا ہے قمر شام کے بعد

بھول جاتی ہے اُنھیں خلق ضرورت کے بغیر
یاد آتا ہے چراغوں کا ہُنر شام کے بعد

راستہ کون دکھاتا ہے اندھیرے میں اسے
کس طرح ڈھونڈتی ہے فاختہ گھر شام کے بعد

پھول اُجلے سے کھلائے ہیں فلک پر کس نے
کھیت چاندی کا ہے کیا پیشِ نظر شام کے بعد

قدرداں صرف ہے رب گریۂ شب کا گلزار
رنگ لائے گا ترا دیدۂ تر شام کے بعد

گلزار بخاری

غزل

نہ کہیں میں، نہ کہیں میرا نشاں ہے بھائی
دُور تک دشت کی وحشت کا سماں ہے بھائی

دل کا کیا حال کہیں ہم کہ مسلسل دل پر
ایک انبوہِ غمِ دل زدگاں ہے بھائی

درمیاں میں فقط اک حد کے سوا کچھ بھی نہیں
کوئی خوش حال یہاں ہے نہ وہاں ہے بھائی

کس سے پوچھیں کہ محبت کا یقیں کس کو ہے
کس سے کہیے کہ وفا سب پہ گراں ہے بھائی

وہ کسی اور کے ہونے کا گماں ہے شاید
اپنے ہونے کا جو تھوڑا سا گماں ہے بھائی

سحر آثار ہے دامانِ افق، آنکھیں کھول
رات خاموش سہی، وقتِ اذاں ہے بھائی

خالد علیم

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

سُوختہ جاں ہوں تو کیا، تیری ہَوائے لُطف سے
راکھ ہو کر تیرے دامن سے لپٹ جاؤں گا مَیں

غزل

تابِ غم ایک گھڑی بھی نہیں لائیں آنکھیں
جی بھر آیا تو اسی آن بھر آئیں آنکھیں

ناروا، اپنا رویہ اسے یاد آیا ہے
بے سبب ہم سے نہیں اس نے چرائیں آنکھیں

روشنی باعثِ زحمت بھی تو ہو جاتی ہے
اس چکا چوند نے کتنوں کی بجھائیں آنکھیں

آنکھ والو، فقط آنکھوں پہ نہ تکیہ کرنا
بارہا یوں بھی ہوا، کام نہ آئیں آنکھیں

کیا کہیں ڈالے ہیں جب جبر کے، آگے ہتھیار
ہم نے پھر خود سے بھی پہروں نہ ملائیں آنکھیں

کم سے کم اس کو نظر بھر کے تو دیکھا ہوتا
جس نے رو رو کے ترے دکھ میں گنوائیں آنکھیں

ناسپاسی بھلا دنیا کی، نئی کب ہے نعیم؟
کیا نیا دیکھ لیا ہے جو بھر آئیں آنکھیں

ضیاالدین نعیم

غزل

[نذرِ اختر حسین جعفری]

یہ صحراؤں کی بستی ہے یہاں دریا نہیں آتا
"فصیلِ شہرِ ممکن پر مجھے چلنا نہیں آتا"

تعاقب میں کئی وحشی درندے چلتے رہتے ہیں
گھنے جنگل میں پگڈنڈی' کوئی رستہ نہیں آتا

غبارِ شام میں سارے ہی تارے ڈوب جاتے ہیں
مسافر چلتے رہتے ہیں اُنھیں رُکنا نہیں آتا

عجب سے شور و غوغا میں سماعت روٹھ جاتی ہے
کبھی ہنسنے کی مشکل ہے' کبھی رونا نہیں آتا

یہ کیسی آہٹیں ہیں' نیندیں ساری چاٹ جاتی ہے
کسی بھی آنکھ میں' اِس شہر میں سپنا نہیں آتا

کسی کے بعد یہ بستی گلی کوچے ہیں اک جیسے
شناسا پوچھتے ہیں کیوں اِدھر اتنا نہیں آتا

مجھے رونے سے ڈر لگتا ہے اور میں ہنستا رہتا ہوں
جو کہنا ہے مجھے عظمیؔ وہی کہنا نہیں آتا

اسلام عظمی

غزل

صفدر صدیق رضی

مئی پر سرکشی سے مت چل
لیکن بیچارگی سے مت چل

تجھ پر بھی حق ہے گمرہی کا
اتنا بھی راستی سے مت چل

پیچھے رہ جائیگی یہ دنیا
اتنا آہستگی سے مت چل

منزل تیری تلاش میں ہے
ایسا بے رہروی سے مت چل

حصہ ڈال اپنا بھی سفر میں
تھوڑی سی کجروی سے مت چل

رستے میں پیچ وخم بہت ہیں
اتنی بھی سادگی سے مت چل

تیرے سپنے ہیں تیرے ہمراہ
ایسے بے مائیگی سے مت چل

اس در سے واپسی ہے لیکن
اے دل اسکی گلی سے مت چل

غزل

یہ کس کا ذکر چھڑا یادِ رفتگاں میں مری
کہ اک دھنک سی اُتر آئی داستاں میں مری

میں اِس زمین اور اِس آسماں کا حصہ نہیں
ہیں اور ارض و سما، وُسعتِ گماں میں مری

دمِ سحر چلی جاتی ہو، خواب ٹُوٹتے ہی
مدام رہتی ہو تم رات بھر اَماں میں مری

نظر میں دور تلک فصلیں لہلہاتی ہیں
ہے جیسے رُوح مقیّد کسی کساں میں مری

یہاں مجھے مرا سایہ نظر نہیں آتا
نجانے کیسے گزر ہو گی سائباں میں مری

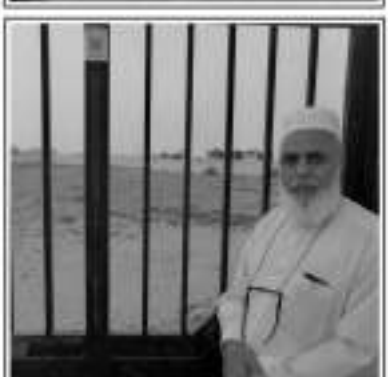

یہ بند کوچہ، یہ چھوٹا سا گھر، یہ تنگ گلی
کٹی ہے عمر اِسی ایک آشیاں میں مری

تمھیں فراغ نہ تھا، پس وہ اَن کہی باتیں
جو گُفتنی نہ ہوئیں، چُھپ گئیں زباں میں مری

ہے میرا ایک تو گھر اس زمیں پہ جانِ انیس!
اور ایک جائے رہائش ہے آسماں میں مری

محمد انیس انصاری

غزل

ڈھلتی عمر کا بوجھ اُٹھانا پڑتا ہے
خود کو کیا کیا یاد دلانا پڑتا ہے

مالک ! مشکل رستہ ہے آسان بنا
ہم جیسوں کو آنا جانا پڑتا ہے

مالک ! جنگل درویشوں کی دنیا ہے
پیڑوں سے بھی حال چھپانا پڑتا ہے

مالک ! نیند آئے تو خواب مکمل ہو
مزدوروں کو رزق کمانا پڑتا ہے

مالک ! حاکم ظالم ہو تو دھرتی پر
مظلوموں کو شور مچانا پڑتا ہے

مالک ! تیری مرضی جس پہ نظر کرے
پتلی کو کردار نبھانا پڑتا ہے

مالک ! اک چہرے پہ کتنے چہرے ہیں
ڈرتے ڈرتے ہاتھ ملانا پڑتا ہے

مالک ! دل میں کتنی ساری یادیں ہیں
یاد کبوتر روز اُڑانا پڑتا ہے

مالک ! اک مجبوری ہم مجبوروں کی
روتے روتے اشک چھپانا پڑتا ہے

آغا نثار

غزل

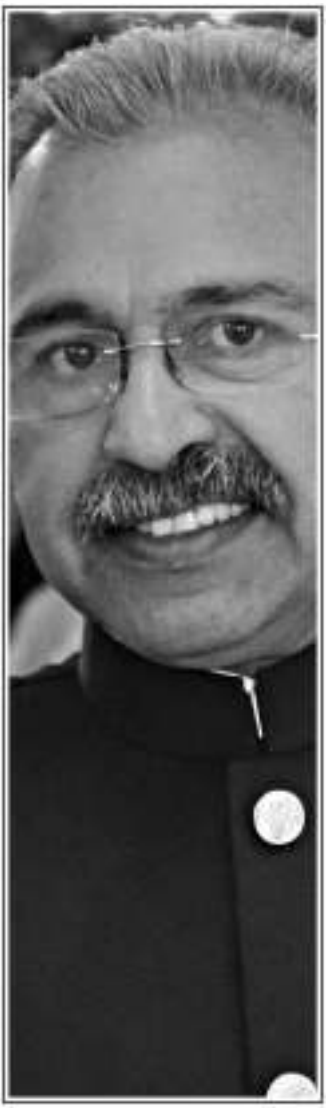

لوگ جب آئی پہ آجائیں تو کب ہیں چھوڑتے
سر ہو زیرِ جامہ ہو دامن ہو یا دستار ہو

آندھیوں کو موردِ الزام ٹھہراتے ہو کیوں
پیڑ ہو سکتا ہے پہلے سے خزاں آثار ہو

رہ گزر ملتی نہیں جھرنوں کو بہنے کے لیے
کب خدا جانے تکلف کا یہ پربت پار ہو

خون سے دیوار پر لکھتے رہو سچائیاں
تم بھی میری طرح پڑھ لکھ کر اگر بے کار ہو

جا رہا ہوں ساتھ لیکن مجھ پہ یہ کھلتا نہیں
کون ہو تم راستہ یا راہ کی دیوار ہو

اس کو راحت اپنے جیسا ہی بنا لیتے ہیں لوگ
آدمی کے روپ میں چاہے کوئی اوتار ہو

راحت سرحدی

غزلیں

بجھتے ہوئے دیے کو بچاؤں میں کس طرح
روٹھی ہے زندگی تو مناؤں میں کس طرح

تو نے کہا تھا تجھ سے بہت دور میں رہوں
اب تیرے سامنے کبھی آؤں میں کس طرح

دھندلا گیا ہے کب سے تری یاد کے بغیر
اس دل کے آئنے کو سجاؤں میں کس طرح

مارا گیا ہوں میں تو محبت کی جنگ میں
اب خود ہی لاش اپنی اٹھاؤں میں کس طرح

اقبال میں تو کوزہ گری جانتا نہیں
ٹوٹا ہوا ہوں خود کو بناؤں میں کس طرح

اقبال سروبہ

آپ سے چاہت کا ہے جو اک تقاضا اور میں
یاد آئے گا مسلسل ایک لحظہ اور میں

اس سے بڑھ کے اور کیا جذبات کا ہوتا لہو
دل کا اب مرجھا گیا ہے پھول تازہ اور میں

میرے دل کی دھڑکنوں کا کب تجھے احساس تھا
رہ گئے دونوں فقط اب چپ کا روزہ اور میں

سایہ میرا اس طرح تھا ساتھ میرے ہمرکاب
جیسے ہو ہمراہ میرے اک جنازہ اور میں

مارا مارا پھر رہا ہے اب ترا اقبال یوں
کھو گئے ہیں جیسے دونوں میرا غازہ اور میں

غزل

ہمارے ذوقِ رفاقت سے بے خبر ٹھہری
حیاتِ حلقۂ احباب مختصر ٹھہری

جنوں کی کار گزاری پہ حرف آیا ہے
کہ بور بور ریاضت بھی بے ثمر ٹھہری

برنگِ گل میں رہا تازگی سے ہم رشتہ
مرے مزاج کی خوشبو نگر نگر ٹھہری

وہ جس نے لفظوں کی حرمت کو معتبر رکھا
اسی کی ذات زمانے میں معتبر ٹھہری

نئے مزاج نے سب کچھ بدل دیا یکسر
پرانی سوچ کی یلغار بے اثر ٹھہری

چمن کی سیر عجب تازگی کی حامل تھی
ہوائے صبح سے ہر بات خوب تر ٹھہری

کسی کے حسنِ طلب سے رہے ہیں وابستہ
یہ زندگی تو ہمیشہ ہی حیلہ گر ٹھہری

یوسف خالد

غزل

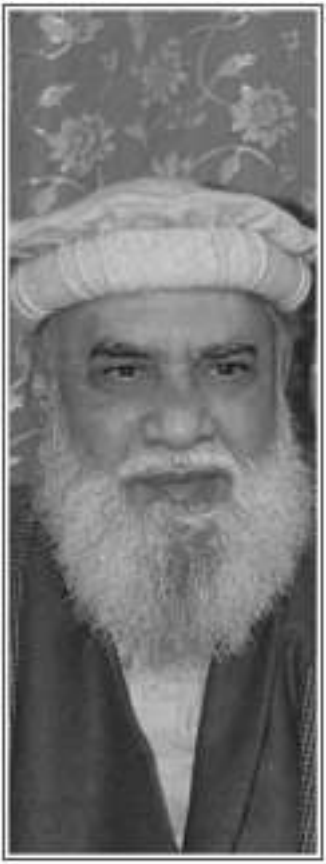

اس نے جس حال میں رکھا، ہمیں جیسا رکھا
اس کا احسان ہے، بہتوں سے ہے اچھا رکھا

میں نہ کہتا تھا، کہ دل کو کسی دھندے پہ لگا
کام کا ہی نہیں رہتا ہے یہ رکھا رکھا

ہے یقیں، حشر میں رسوا نہیں ہونے دے گا
جس نے دنیا میں گناہوں پہ ہے پردہ رکھا

پہلے اس امتِ احمد میں ہمیں پیدا کیا
پھر ہے بخشش کو محمد کا وسیلہ رکھا

ایک کردار ڈبونا تھا سو اکرم ناصر
اس نے ناول میں ہے بپھرا ہوا دریا رکھا

اکرم ناصر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کچھ تو سمجھاؤ ، کچھ تو بتاؤ
کوئی تو جیتا ، کوئی تو ہارا

غزل

وہ جگنوؤں کی طرح شب کو جگمگاتا ہے
ستارہ بن کے کبھی راستہ دکھاتا ہے

مہ و نجوم بہت پیچھے چھوڑ آیا ہے
وہ کہکشاؤں کو اب راستہ بتاتا ہے

وہ بھول کر بھی مرے گھر کا رخ نہیں کرتا
میں جانتا ہوں گلی میں تو آتا جاتا ہے

اسے بھلانے کی صورت نظر نہیں آتی
میں اس کو جتنا بھلاتا ہوں، یاد آتا ہے

بڑے خلوص سے کرتا ہے میری رہ دشوار
جو دور دور سے پتھر اٹھا کے لاتا ہے

جنون کھینچتا رہتا ہے دشت کی جانب
رکوں تو کیسے رکوں نجد جب بلاتا ہے

وہ جانتا بھی ہے کتنی چھتیں سروں سے چھنی
خیالوں خوابوں میں اب بھی جو گھر بناتا ہے

کروں تو کیسے کروں ظلمتوں سے سمجھوتا
ازل ازل سے اجالوں سے میرا ناتا ہے

پکار دل کی وہ سنتا نہیں ہے پھر بھی جلیل
سلگتا رہتا ہے خود بھی مجھے جلاتا ہے

احمد جلیل

غزل

ہیں یاں آسیب رقصاں بے حسی کے
بدلنا ہوں گے تیور شاعری کے

یہ دو دن بھی نہ چل پائے گی صاحب
تمہاری سوچ کے ہیں رنگ پھیکے

ہو مشکل کاش یہ کارِ عداوت
کچھ ایسے ضابطے ہوں دشمنی کے

بہت ہلکے ہو میزانِ جہاں پر
کرشمے ہیں یہ سب ناطاقتی کے

ابھی للکارتے رہیے عدم کو
ابھی آثار ہیں کچھ زندگی کے

جہاں بینی ہے یہ بھی اک طرح کی
ہیں معنی یہ بھی اک آوارگی کے

تو پھر بت گر کی کیا تعظیم ہو گی
اگر آداب ہیں کچھ مورتی کے

وہ چاہے وصل ہو یا ہجر ثاقبؔ
ہیں رشتے دونوں اک وابستگی کے

منظور ثاقب

غزل

جب غُبار اُٹھتا ہوا دل پہ نظر آتا ہے
تب کہیں جا کے اِن آہوں میں اثر آتا ہے

جانے والے نے تو جانا ہی تھا اِک دن آخر
دیکھنا یہ ہے کہ اب کیسے وہ گھر آتا ہے

اُس کے چہرے پہ اُداسی کے نشاں واضح ہیں
کسی آسیب میں لپٹا وہ نظر آتا ہے

محوِ پرواز ہوں میں عرش کی جانب کب سے
میری جانب کوئی کب خاک بسر آتا ہے

جیسے ملتا ہے کوئی ویسے ہی ملتا ہوں اُسے
مُجھ کو احباب سے ملنے کا ہُنر آتا ہے

تیری یادوں کو میں جب ساتھ لیے پھرتا ہوں
راہ میں پیش بلندی کا سفر آتا ہے

اب بھی تاثیر اُسے ڈھونڈ رہی ہیں آنکھیں
وُہ جو پلکوں پہ لیے بادِ سحر آتا ہے

تاثیر نقوی

غزل

مانا ، کسی کے ہجر میں ہم مر نہیں گئے
زخمِ وفا ہنوز ، مگر بھر نہیں گئے

گردن کٹے ، زبان کٹے ، زہر ہو نصیب
حق بات برملا ہی کہی ، ڈر نہیں گئے

کب ، آرزوئے وصل نہ تھی حاصلِ حیات
کب ، کوچۂ نگار سے ہو کر نہیں گئے

پاؤں سے دشتِ شوق ، یوں لپٹا کہ عمر بھر
ہم سے جنوں سرشت ، کبھی گھر نہیں گئے

بیٹھے رہے فقیروں کے در پر بصد نیاز
لیکن ، کسی بھی شاہ کے در پر نہیں گئے

دل سے ہوئیں نہ محو ، تری خوش کلامیاں
آنکھوں سے تیری دید کے منظر نہیں گئے

دنیا تو چاند تاروں سے آگے نکل گئی
شوکت ، مدارِ عشق سے باہر نہیں گئے

شوکت محمود شوکت

غزل

خواب میں خود کو جو ہم یوسفِ کنعاں دیکھیں
اس کا کیا راز ہے تعبیر میں پنہاں دیکھیں

مجھ سے ملنے کے لئے تجھ کو پریشاں دیکھیں
آرزو تھی سبھی ایسے تجھے جاناں دیکھیں

کاش ہو جائے تو نفرت سے محبت فطرت
تجھ پہ بھی ہوتے ہوئے دنیا کو حیراں دیکھیں

جان، حسرت ہے فقط اپنی دوانی پا کر
باقی کل دنیا سے ہم تم کو گریزاں دیکھیں

تم سے دوری کے اندھیروں میں کٹا دن سارا
ہو گئی رات چلو جشنِ چراغاں دیکھیں

تو نے بخشا ہے خدایا اسے کیسا یہ جلال
اس کو چھوتے ہوئے ہر ہاتھ کو لرزاں دیکھیں

انقلاب ایسا کیا پیدا عزائم نے مرے
جاں گسِل تھا جو کبھی اب ہے نگہباں دیکھیں

ذکی طارق

غزل

ملیحہ سیّد

دو گھڑی ہجر سے رہائی دے
کون گریہ کرے ، دُہائی دے

میں نہیں چاہتی کہ روتی رہوں
میں نہیں چاہتی جدائی دے

رنج دیکھوں بجھے چراغوں کا
اور اداسی مجھے سنائی دے

جانتی ہوں میں وحشتوں کا سبب
بات مت ٹال مت صفائی دے

خواب جو آنکھ میں بکھرتا ہے
ہنسنے والوں کو وہ دکھائی دے

زندگی کے قفس میں خوش ہے تُو
جا خدا تجھ کو آشنائی دے

اَن گنت خواہشوں کے مرہم کو
میرے زخموں تلک رسائی دے

غزل

مسند نشیں ہے غیرت و پندار بیچ کر
شہہ نے کہانی لکھی ہے کردار بیچ کر

دام و درم نہیں تھے مگر سر بلند تھا
سر بارِ دوش ہو گیا دستار بیچ کر

ان کا تو نام تک نہیں تاریخ میں کہیں
تھی صلح کی طلب جنہیں تلوار بیچ کر

یاروں سے جو ہمیشہ کئے نقدِ جاں طلب
خود شہر یار بن گئے ہیں یار بیچ کر

نان و نمک کے واسطے مالک مکان نے
بے گھر بنا دیا در و دیوار بیچ کر

حرمت ، نسب ، انا کو مگر پیٹتے رہے
گھر کی ہر ایک شئے سرِ بازار بیچ کر

جاذب فقیہہِ شہر سدا معتبر رہا
انکار بیچ کر کبھی اقرار بیچ کر

شکیل جاذب

غزل

نہ میرے پاس سے اے نورِ کم نگاہ گزر
میں وہ نہیں جو کہے گا شبِ سیاہ گزر

ہوائے تیز نگاہِ الم نہ شہر پہ ڈال
گزرنا طے ہے تو پھر سب کی خیر چاہ، گزر

پلٹ کے راہ سے تیری کوئی نہیں آیا
کوئی شجر ہے تو کوئی ہے خاکِ راہ گزر

یہاں نہیں کوئی رنجِ کشادگی اے غم
یہ شام جادۂ دل ہے سو بے پناہ گزر

زمین سخت ہے مانا مگر سحرؔ اِس سے
نہیں مضائقہ کوئی جو گاہ گاہ گزر

حسنین سحرؔ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

بے کسوں کی طرح ہم بھی ہاتھ مل کر رہ گئے
کیا کہیں خالد، پسِ دیوارِ زنداں کیا ہوا

غزل

سامان وہ رکھا ہے قرینے سے ہمارا
اب کوچ ضروری ہے مدینے سے ہمارا

اس نے ہمیں تاریخ کے تہ خانے میں رکھا
سو رزق اترتا رہا زینے سے ہمارا

اک یاد کے نقشے پہ کھنڈر کھود رہے ہیں
اک خواب نکلنا ہے دفینے سے ہمارا

جس دن سے وہ بچھڑا ہے سیے جاتے ہیں سینہ
جی بھرتا نہیں سینے کے سینے سے ہمارا

برداشت کیے جائیں ترے عہدِ ستم کو
ایسا بھی تعلق نہیں جینے سے ہمارا

لگتا ہے تری ڈور کہیں اور بندھی ہے
جو رابطہ ٹوٹا ہے مہینے سے ہمارا

یہ بوجھ نہیں، بوجھ اٹھانے کے لیے ہے
مت ہاتھ ہٹانا کبھی سینے سے ہمارا

حیران تکے جاتے ہیں ہم یاروں کے چہرے
پڑتا ہے عجب واسطہ کینے سے ہمارا

وہ آنکھ اٹھے یا نہ اٹھے اپنی بلا سے
اب ربط بہت خاص ہے پینے سے ہمارا

شہزاد نیر

غزل

دعا میں آہ بھر کر رہ گیا ہوں
میں تجھ سے اے خدا کیا کہہ گیا ہوں

کوئی تارہ مرے گھر میں نہ اُترا
فلک میں دیکھتا ہی رہ گیا ہوں

خوشا گرداب جس میں ڈوب کر میں
ترے ساحل کی جانب بہہ گیا ہوں

توجہ سے رہا محروم گرچہ
تری دنیا بھی آخر سہہ گیا ہوں

سب اپنے ساتھیوں سنگ اُٹھ گئے ہیں
میں اپنے پاس بیٹھا رہ گیا ہوں

تھکن تھی راستے کی ایسی روشن
میں منزل پر پہنچ کر ڈھہ گیا ہوں

اعجاز روشن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم گوش بر آواز پھرے ہیں خالد
ہم نے جی بھر کے سنا ، پختہ گھروں کا رونا

غزلیں

کیسی اونچی سامنے ہے دیوار کھڑی
سوچ رہی ہوں تنہا اس کے پار کھڑی

دل پاگل ہے خود سے اُلجھتا رہتا ہے
روز نئی کر دیتا ہے تکرار کھڑی

کس کا میں یوں رستہ تکتی رہتی ہوں
اِن راہوں پر، مدّت سے بے کار کھڑی

اُس کا وعدہ تارہ ، تارہ ٹوٹ گیا
آنکھ رہی پھولوں کا لے کر ہار کھڑی

رخشندہ! کٹنے کو ہے سَر ، سوچ ذرا
رہنا! قائم باتوں پہ سرِ دار کھڑی

رخشندہ نوید

درد اس حد تک ان آنکھوں میں بھر آیا ہے تو کیوں؟
بار دیگر دل کے ہاتھوں زخم کھایا ہے تو کیوں؟

کیوں اگر ترکِ محبت تھی تو ایسا کیوں ہوا؟
آخر اس کو دیکھ کر دل مسکرایا ہے تو کیوں؟

شام ڈھلنے پر نہ جانے گم کہاں ہو جائے گا
ساتھ کیوں رہتا نہیں وہ میرا سایہ ہے تو کیوں؟

پڑ گیا کچھ کم تجھے کیا تیری آنکھوں کا اُفق
تو نے پلکوں سے ستاروں کو گرایا ہے تو کیوں؟

جب محبت کے سہارے زیست جی سکتے ہیں ہم
پھر سکونِ قلب کا اک نام مایا ہے تو کیوں؟

اپنی رخشندہ گزار اب شعر کہہ کر زندگی
تجھ کو آخر رب زمیں پر لے کر آیا ہے تو کیوں؟

غزل

مجھے اس نے جدا رکھا ہوا ہے
مثالِ آئنہ رکھا ہوا ہے

لحد پر ماں کی جو مانگو ملے گا
وہاں دستِ دعا رکھا ہوا ہے

جہاں مسدود ہو جاتی ہیں راہیں
وہیں پر راستہ رکھا ہوا ہے

دھنک کے سات رنگوں سے علیحدہ
ترا دستِ حنا رکھا ہوا ہے

مدینہ اور نجف کے درمیاں ہی
مقامِ کربلا رکھا ہوا ہے

ہوا سے دوستی کرنے چلے ہیں
ہتھیلی پر دیا رکھا ہوا ہے

مثالِ صبحِ نو ہے اپنا سینہ
یہاں نورِ خدا رکھا ہوا ہے

وہاں نیزوں پہ سر روشن ہوئے ہیں
جو حق کا راستہ رکھا ہوا ہے

جدا اس کے بدن کی سب تراشیں
نیا ہر زاویہ رکھا ہوا ہے

یہاں سجدے بھی اب بازی گری ہیں
جدا سب نے خدا رکھا ہوا ہے

عقیل اپنے مقدر میں ازل سے
دلِ درد آشنا رکھا ہوا ہے

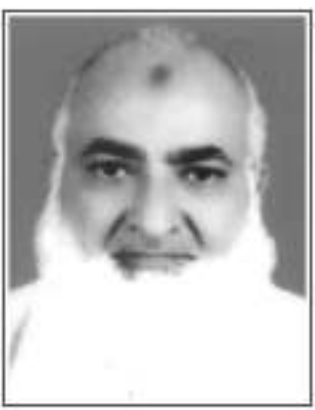

عقیل رحمانی

غزل

مجھ کو مرے خلاف کیا اور چل دیا
اس نے یہ اعتراف کیا اور چل دیا

میں نے کہا فقیر کو بابا معاف کر
اس نے مجھے معاف کیا اور چل دیا

در پردہ اختلاف تو سب نے کیا مگر
اس نے یہ واشگاف کیا اور چل دیا

وہ رات بھی شدید دسمبر کی رات تھی
میں نے بدن لحاف کیا اور چل دیا

ترکیب زیرِ غور کوئی لو لحاظ کی
انکار صاف صاف کیا اور چل دیا

اک موم جیسے شخص نے اشکوں کے زور پر
پتھر میں یہ شگاف کیا اور چل دیا

لایا گیا تھا گھیر کے صحرائے نجد میں
دل نے وہاں طواف کیا اور چل دیا

وہ نیلے آسمان پہ کرنوں کی اوڑھنی
تاروں کو نور باف کیا اور چل دیا

نوحہ روایتوں کا پڑھا زور شور سے
قدروں سے انحراف کیا اور چل دیا

آنکھوں سے اک پیام دیا تو کھلا کھلا
چلمن کو پھر غلاف کیا اور چل دیا

پہلے تو اتفاق میں برکت کی بات کی
پھر خود ہی اختلاف کیا اور چل دیا

مسعود تھا وہ رونقِ بازار ایک دن
پھر شہر کو مضاف کیا اور چل دیا

مسعود احمد

غزلیں

اپنے پندار سے نکل آیا
یعنی آزار سے نکل آیا

آر تھے مجھ کو ڈھونڈنے والے
اور میں پار سے نکل آیا

آخرش رونما تو ہونا تھا
آخرش غار سے نکل آیا

میں جو منکر ہوا تو وہ کافر
اپنے انکار سے نکل آیا

شعلہ دل میں چھپا لیا اس نے
رنگ رخسار سے نکل آیا

در بنانے سے پیشتر شاہدؔ
کوئی دیوار سے نکل آیا

افتخار شاہد

خواب اپنے بھی اسی طور ٹھکانے لگ جائیں
رقص کرتے ہوئے ہم خاک اڑانے لگ جائیں

مرے دشمن کو فقط ایک ہی اندیشہ ہے
مرے بچے بھی نہ تلوار اٹھانے لگ جائیں

زندگی آج تجھے ساتھ لیے پھرتے ہیں
کل ترا بوجھ بھی شانوں سے گرانے لگ جائیں

خواب زادوں کو ترے پاؤں کی آہٹ جو لگے
اپنی سوئی ہوئی تقدیر جگانے لگ جائیں

ہم ترے لمس کی شدت سے بھرے بیٹھے ہیں
تری خواہش ہے کہ ہم عشق کمانے لگ جائیں

مسئلہ یہ ہے کہ اس زلف کا اک بل نہ کھلا
آرزو یہ ہے کہ تقدیر بنانے لگ جائیں

پوچھ بیٹھیں جو کسی سے کبھی تیرے بارے
پھر تو بس لوگ فسانے ہی سنانے لگ جائیں

کاش ہم لوگ کبھی خواب سے باہر نکلیں
کاش ہم لوگ بھی تعبیر بنانے لگ جائیں

تم جو کہتے ہو کہ تاروں کو بجھا دیں شاہدؔ
تم جو کہتے ہو تو کیا آگ لگانے لگ جائیں

غزل

ہم گفتگو کے پھول کھلانے میں لگ گئے
کچھ لوگ جل کے دھول اڑانے میں لگ گئے

وہ ملتفت تھے اور دہائی کا وقت تھا
ہم لوگ دل کے زخم چھپانے میں لگ گئے

کچھ شعر تھے جو حاصلِ عمرِ رواں ہوئے
افسوس ! ہم بھی نام کمانے میں لگ گئے

اک گیند جا لگی تھی درختوں کے جھنڈ میں
طائر تمام حشر اٹھانے میں لگ گئے

سب پھول چن رہے تھے مظفر حسن بلوچ
ہم سادہ لوح، خار ہٹانے میں لگ گئے

مظفر حسن بلوچ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ خواب خواب سا تن جاگ سا گیا آخر
اسیرِ دَر بھی دریچوں تک آ گیا آخر

غزل

تیرے دل سے نکل کر کدھر جاؤں گا
ہے یہی قول واثق کہ مر جاؤں گا

اس کے در پر محبت کی خیرات کو
اپنے سینے میں لے کر ہنر جاؤں گا

میری حالت اگرچہ دگر گوں سہی
چھوڑ دے ناصحا میں سنور جاؤں گا

کچھ کروں نہ کروں اس جہاں میں اگر
بس محبت کی توقیر کر جاؤں گا

راستی آج کے دور کا فن نہیں
جھوٹ کے پاؤں پر آج گھر جاؤں گا

عشق کو میں بچاؤں گا تشہیر سے
اور اگر کھل گیا تو مکر جاؤں گا

عابدی میں بہاروں کا پروردہ ہوں
پھول کھلنے لگیں گے جدھر جاؤں گا

علی حسین عابدی

غزل

ہجر کا بھی امکان کہاں تھا
وصل کا بھی ارمان کہاں تھا

ہر آواز پہ لوٹ آیا تھا
مجھ جیسا نادان کہاں تھا

کوفہ والے بدل گئے تھے
جو کہتے تھے مان کہاں تھا

وصل کے منظر لکھنا چاہے
ہجر مرا عنوان کہاں تھا

تو میری پہچان ہوا ہے
میں تیری پہچان کہاں تھا

تم تو اِک انمول رتن تھے
عشق کا یہ تاوان کہاں تھا

صحرا صحرا گزر ہوا ہے
رخت کہاں ، سامان کہاں تھا

طلعت شبیر

غزل

جہاں سے لوگ شبوں میں سحر نکالیں گے
وہیں کہیں سے حوادث بھی سر نکالیں گے

ہمیں بھی کوہ کنی کا شغف ہے برسوں سے
کسی پہاڑ سے لعل و گہر نکالیں گے

بچا کے لائیں گے کشتی کو تند موجوں سے
سمندروں میں اُتر کر سفر نکالیں گے

ہمارے بعد کوئی داستان لکھے گا
ہمیں بھی خاک سے اہلِ ہنر نکالیں گے

بہت سے رشتے ہیں دیوار و در میں لپٹے ہوئے
اسی مکان سے ہم اپنا گھر نکالیں گے

محمد نوید مرزا

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثناگر وضو کریں

غزل

جہاں جہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے
مگر کہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

وہاں، وہاں مری آنکھیں پہنچ چکی ہونگی
جہاں، جہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

جہاں جہاں بھی کوئی دیکھنے کی صورت ہو
وہاں ، وہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

رگوں میں دوڑتے اک سرخ اضطراب کے ساتھ
رواں دواں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

ذرا شبیہہ سے ملتی تو ہو شبیہہ کوئی
کہوں، کہ ہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

میں دونوں ہاتھ ملاتا ہوں جب دعا کے لیے
تو درمیاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

کہیں نہیں کوئی چہرا تمھارے جیسا مگر
یہاں وہاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

مری نظر کا شغف ہے فقط تمہاری دید
سو رایگاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

بہ صد یقیں کوئی مجھ سا ہو دیکھنے والا
بہ ہر گماں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

نہ حالِ دل کوئی تم سا ہے جاننے والا
نہ حرزِ جاں کوئی تم سا دکھائی دیتا ہے

محمد سلیم ساگر

غزل

نین سوالی رہ جاتے ہیں
پنجرے خالی رہ جاتے ہیں

وقت کا دریا بہہ جاتا ہے
نقش خیالی رہ جاتے ہیں

لوبھ غرض کے برتن سارے
آخر خالی رہ جاتے ہیں

پنکھ پکھیرو اُڑ جائیں تو
تنہا مالی رہ جاتے ہیں

روپ کا سونا ڈھل جاتا ہے
جھمکا بالی رہ جاتے ہیں

خوشیاں بھک سے اُڑ جاتی ہیں
رنگ ملالی رہ جاتے ہیں

مٹ جاتے ہیں فتوے والے
سیدؔ ، حالی رہ جاتے ہیں

فانی دنیا میں لافانی
لوگ مثالی رہ جاتے ہیں

تسنیم کوثر

غزل

بھلا یہ کارِ ولایت کسی سے ہوتا ہے
کسی سے ہوتا نہیں جو علیؑ سے ہوتا ہے

نکل ہی آتے ہیں کچھ دوست مشترک اپنے
کہیں کہیں سے تعلق سبھی سے ہوتا ہے

ہم انکسار کے بل پر ہی آگے بڑھتے ہیں
ہر اک ہنر میں اضافہ کمی سے ہوتا ہے

ہم اختلاف کہاں تک کریں کہ آخر کار
ہمیں تو شام کو ملنا اُسی سے ہوتا ہے

خوشی کی بات پہ آنسو بہانا ٹھیک نہیں
خوشی کا کام ہمیشہ خوشی سے ہوتا ہے

ہمارے اشک جگہ عرش پر بناتے ہیں
دعا کا پیڑ توانا نمی سے ہوتا ہے

کبھی کبھی تو مجھے اتنی داد ملتی ہے
کہ سارے گھر کا گزارہ اِسی سے ہوتا ہے

مجال ہے جو کسی کو خبر بھی ہونے دیں
گزر ہمارا بھی اس کی گلی سے ہوتا ہے

فخر عباس

غزل

قافلہ بے قطار تھا اپنا
اور میں سوگوار تھا اپنا

اب تو کچھ بھی نظر نہیں آتا
آنکھوں میں شمار تھا اپنا

گرد بیٹھی تو میں نظر آیا
جسم سارا غبار تھا اپنا

آنکھ تھی اور حسن تھا اس کا
دل کوئی آبشار تھا اپنا

اندر پلٹ کے آیا ہوں
دیر* سے انتظار تھا اپنا

*__ تصرف میر تقی میر

فیصل ہاشمی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خاک پر خاک کی ڈھیریاں رہ گئیں
آدمی اُٹھ گئے ، نیکیاں رہ گئیں

غزل

دے کر مجھے اُلفت کا یہ آزار، مرے یار
کر ڈالا مری زیست کو دشوار، مرے یار

یہ وادیٔ پُرخار ہے اور تیز ہَوا ہے
گر جائے نہ سر سے ترے دستار، مرے یار

دے گا مِرا ماضی مِری عظمت کی گواہی
ہوتی تھی مِری ذات ہی شہکار مِرے یار

کیا چیز پسِ پردۂ احوالِ جنوں ہے
کھل جائیں گے اِک روز یہ اسرار، مِرے یار

ہو جانے کو ہے ختم یہ ہستی کی مسافت
ہر شخص ہی چلنے کو ہے تیار، مِرے یار

ہر شخص یہاں زر کی پرستش میں مگن ہے
کوئی نہیں یوسف کا خریدار، مِرے یار

میں ہی تھا ندیمِ رہِ ہستی، سو مجھے بھی
کر ڈالا ترے عشق نے بے کار، مِرے یار

ریاض ندیم نیازی

غزل

شاخ کوئی ہری بھری ٹھہرے
باغ میں میری نوکری ٹھہرے

ایک دھمکی سے ڈر گئے صاحب
آپ کس بات کے جَری ٹھہرے

ایک تعویذ بھیجنا ہے اُسے
کوئی جِن آئے یا پَری ٹھہرے

ہم محبت کے اِس خرابے میں
سَرسَری آئے سَرسَری ٹھہرے

بھولنے میں پہل کریں گے ہم
کوئی تو اپنی بَرتَری ٹھہرے

ہاں! سزا بھی اُسے سنائیں گے
پہلے اِلزام مُخبری ٹھہرے

ساری دُنیا ہی زیر ہو جائے
ایک پَل کو جو خود سَری ٹھہرے

یوں تری یاد کی شفق پھوٹی
رنگ آنکھوں میں سنگتری ٹھہرے

شبہ طراز

غزل

رہنما اپنا ستاروں کو بنانے والا
ہو گیا خاک بسر چاند پہ جانے والا

سچ بتاؤ کہ بدل تو نہیں جاؤ گے تم؟
روز کہتا تھا مجھے چھوڑ کے جانے والا

شہر ویران رہا نیند میں بھی آنکھوں کا
سو گیا جانے کہاں خواب دکھانے والا

اب نہ وہ مست ہوا ہے نہ وہ رنگ و خوشبو
راستہ بھول گیا راہ دکھانے والا

منتظر آج بھی رستے میں پڑی ہیں آنکھیں
آج بھی لوٹ کے آیا نہیں جانے والا

کب دلائے گا مجھے جرمِ محبت سے نجات
میرے احساس کو زنجیر بنانے والا

غم سے حیرت زدہ تصویر کی آنکھیں ہی نہیں
خود بھی حیران ہے تصویر بنانے والا

اس کا بجھتا ہوا چہرا تو کبھی دیکھ کہ وہ
کیسے جاتا ہے ترے شہر سے جانے والا

اشرف کمال

غزل

اظہر فراغ

اس لیے بھی میرے ماتھے پر شکن کوئی نہیں
صبر کرنے کے علاوہ آپشن کوئی نہیں

اس کے اترن بھی مکمل جسم ہیں اپنی جگہ
ان بھری الماریوں میں پیرہن کوئی نہیں

خواب کی آسائشوں نے کر دیا غافل ہمیں
پتھروں پر سو رہے ہیں اور چبھن کوئی نہیں

ہر کسی کے واسطے محبوب کا نعم البدل
سچ کہوں تو چاند جیسا بدچلن کوئی نہیں

واپسی پر شاخ بھی ہوتی نہیں اپنی جگہ
ہم پرندوں سے زیادہ بے وطن کوئی نہیں

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد نمازِ مدح ادا ہو تو کس طرح
کس نم مہک سے تیرے ثناگر وضو کریں

غزل

زمانے کے قلندر ایک جیسے ہیں
فقیروں میں سکندر ایک جیسے ہیں

چلے آتے ہیں خود ہی جانبِ مقتل
قبیلے کے دلاور ایک جیسے ہیں

کھڑی ہیں بیچ انساں کے فصیلیں کیوں
رگوں میں جب عناصر ایک جیسے ہیں

محبت پاک جذبوں کا سمندر ہے
سمندر کے شناور ایک جیسے ہیں

کسی کی یاد میں وہ بے خبر بیٹھے
مزاروں کے مجاور ایک جیسے ہیں

جدھر دیکھا نظر بھر کے چناروں کو
تباہی کے مناظر ایک جیسے ہیں

اگائے جو کسی نے بیج نفرت کے
شجر اب وہ تناور ایک جیسے ہیں

سروں میں ایک سا سودا سمائے سب
سفینے کے مسافر ایک جیسے ہیں

سجائے درد کی دولت ہتھیلی پر
مقدر کے سکندر ایک جیسے ہیں

مرزا سکندر بیگ

غزل

کبھی نہ لوٹ کے آنے کی بات کرتے ہُوئے
رُکا ہُوا تھا وہ جانے کی بات کرتے ہُوئے

گِرا زمیں پہ وہ ایسا ، کہ پھر اُٹھا نہ گیا
کِسی کا بوجھ اُٹھانے کی بات کرتے ہُوئے

کِسی کے دِل کی تمنا کا خُون کر بیٹھا
کِسی کی جان بچانے کی بات کرتے ہُوئے

کِسی کا ذِکر ہُوا بار بار محفِل میں
کِسی کو دِل سے بُھلانے کی بات کرتے ہُوئے

کِسی نے اپنی ہی سانسوں کا ساتھ چھوڑ دیا
کِسی کا ساتھ نبھانے کی بات کرتے ہُوئے

پُرانے گھر کے تصوُّر سے آنکھ بھر آئی
نیا مکان بنانے کی بات کرتے ہُوئے

وہ اپنا حال سُناتے ہی رو دیا کیفی!
جو ہنس رہا تھا زمانے کی بات کرتے ہُوئے

محمود کیفی

غزل

دشمن ہے وہ لیکن مرا معیار نہیں ہے
کیونکہ وہ ابھی صاحبِ کردار نہیں ہے

بونے ہیں مکیں شہر کے دستار کی نسبت
سو کوئی یہاں صاحبِ دستار نہیں ہے

سہہ سکتا ہے ہر ظلم ترا جان پہ لیکن
دل ترکِ تعلق کا روادار نہیں ہے

تھوڑی سی عطا کردے تو خیرات محبت
دل اس سے زیادہ کا طلب گار نہیں ہے

انجان ہیں یہ ہاتھ ابھی لمس بدن سے
یہ آنکھ ترے جسم کی زوار نہیں ہے

پھرتا ہوں میں گلیوں میں لیے جنس محبت
کوئی بھی مگر اس کا خریدار نہیں ہے

اس شہر میں اے یار فقط تیرے علاوہ
کوئی بھی محبت کا سزاوار نہیں ہے

جو جی میں ترے آئے، مرے دل تو وہی کر
رستے میں ترے اب کوئی دیوار نہیں ہے

کیا اس سے بڑی ہوگی قبیلے سے بغاوت
ہاتھوں میں قلم ہے مرے تلوار نہیں ہے

وہ جس نے جلا رکھا ہے رستے میں دیا وہ
رہزن ہے کوئی قافلہ سالار نہیں ہے

خود سے ہی لپٹ گریہ کناں ہو کہ یہاں پر
اے دل ترا کوئی بھی عزادار نہیں ہے

اس شہر میں بس ایک ہی عمار ہے تاثیر
کوئی بھی یہاں دوسرا عمار نہیں ہے

تاثیر جعفری

غزل

بغیر بخت کے خود آگہی نہیں آتی
عطا نہ ہو تو کبھی خسروی نہیں آتی

تو اختلاف بھی سمجھا مخالفت یعنی
یہ طے ہُوا کہ تجھے دوستی نہیں آتی

امیرِ شہر نے دی ہیں تسلیاں لیکن
کسی کے غم میں ذرا بھی کمی نہیں آتی

بہار آئی ہے لیکن تمام لوگوں کو
ہنسی کی بات ہو پھر بھی ہنسی نہیں آتی

تو جا رہا ہے مگر تجھ کو یہ نہیں معلوم
ترے بغیر ہمیں زندگی نہیں آتی

صغیرؔ سوچتے رہتے ہیں جس کے بارے میں
وہ جب ملے تو کوئی بات ہی نہیں آتی

صغیر احمد صغیر

غزل

انصر حسن

کس کا جیون یار خراب و خوار نہیں
کون تمہاری آنکھوں کا بیمار نہیں

جس ٹہنی کو تم نے ہاتھ لگایا تھا
اس ٹہنی پر پھول کھلے ہیں، خار نہیں

کون بچائے بستی کو طغیانی سے
بستی والے بستی کے غمخوار نہیں

عید مبارک کہنے والے لوگو میں
گلے لگانے والا کوئی یار نہیں

اس نے میرے نام کو کیوں تبدیل کیا
میرا نام تو انصؔر ہے، انصار نہیں

انتخاب
خالد احمد
نعمان منظور

مرے خدا مرے اشکوں کی سطر کون پڑھے
مری زباں میں تو گرہیں سی پڑنے لگتی ہیں

غزلیں

ایک پلڑے میں مجھے رکھ کے اٹھا لے دنیا
جا اگر ایسے ہی خوش ہے تو کما لے دنیا

لازمی تھا کہ معاف آپ کو کرتا جاؤں
کیا خبر کل کو مرا خون بہا لے دنیا

نقشِ ایام کسی طور نہیں مٹ سکتے
چاہے اب چاک پہ جتنا بھی گھما لے دنیا

یہ ہنسی بھی تو ہے بے فیض سفر کا حاصل
ہم دکھانے سے رہے پاؤں کے چھالے، دنیا

خود کو تنہا نہ سمجھ لینا بچھڑنے والے
جب کبھی چار طرف سے تجھے آ لے دنیا

جا تعاقب ہی اگر سائے کا ہے شوق ترا
آنکھ پر باندھ لے سینے سے لگا لے دنیا

عذر ہم اپنے تئیں اور ہی کچھ پیش کریں
یہ بھی ممکن ہے کہ مفہوم جدا لے دنیا

آپ بھی پل میں بدل سکتے ہیں رائے اپنی
کل اگر خاک کو افلاک بنا لے دنیا

خود کو گرنے سے بچانا بھی ہے لازم جاذب
چند لمحوں کو جو کاندھے پہ اٹھا لے دنیا

اکرم جاذب

دماغ حیلہ و تدبیر میں لگا ہوا ہے
مگر جو دل ہے وہ تقدیر میں لگا ہوا ہے

عدو رجز نہیں اب امن کے ترانے پڑھے
کہ تیر سینۂ شمشیر میں لگا ہوا ہے

اسے بتاؤ سبھی سامعین جا بھی چکے
برابر ایک ہی تقریر میں لگا ہوا ہے

یہ لگ رہا ہے کہ عجلت میں فیصلے ہوئے ہیں
کسی کا سر کسی تصویر میں لگا ہوا ہے

کھٹکتا رہتا ہے تاریک بین نظروں میں
سیاہ دھبہ جو تنویر میں لگا ہوا ہے

بنی ہے فیصلہ جاذبؔ دلیل منصف کی
کہ میرا سینہ خود اس تیر میں لگا ہوا ہے

غزلیں

ہیگل کا فلسفہ بھی سفر میں تھا
ایڈم کا رمزیہ بھی سفر میں تھا

ہم سب بھی دائروں میں ہی چلتے تھے
ہر ایک دائرہ بھی سفر میں تھا

منزل کے راستے بھی سفر میں تھے
منزل سے فاصلہ بھی سفر میں تھا

بے نام منزلوں کی طرف جاتا
لمحوں کا سلسلہ بھی سفر میں تھا

ہر گام تشنگی ہی بڑھی اس کی
اس دل کا مدعا بھی سفر میں تھا

منزل سفر میں تھی میں سفر میں تھا
کچھ ایسا مسئلہ بھی سفر میں تھا

جب وقت سے بھی آگے بہت تھے ہم
اک ایسا مرحلہ بھی سفر میں تھا

بشیر احمد حبیب

کچھ دل کے مسئلے بھی الگ سے تھے
چاہت کے ضابطے بھی الگ سے تھے

ساقی کے فیصلے بھی الگ سے تھے
محفل میں ہم رہے بھی الگ سے تھے

الفت میں مشکلیں بھی الگ ہی تھیں
الفت میں حوصلے بھی الگ سے تھے

چاہت میں قربتیں بھی الگ سی تھیں
چاہت میں فاصلے بھی الگ سے تھے

کچھ تو حسین بھی وہ غضب کا تھا
کچھ دل کے وسوسے بھی الگ سے تھے

کچھ زخم زخم تھے مرے پاؤں بھی
اور کچھ وہ راستے بھی الگ سے تھے

کچھ اس کی بات دل کو لگی بھی تھی
کچھ دل کے مشورے بھی الگ سے تھے

غزل

نیم کے پیڑ جیسی فضا ہے مرے تلخ آباد کی
تازہ دم ہوں کہ صحت فزا ہیں ہوائیں تری یاد کی

میں تو جس حال میں ہوں سو ہوں، دو نجانے ہے کس حال میں
کائناتوں سے کوئی نہ لایا خبر میرے ہم زاد کی

اِس سے پہلے کہ سر اپنا ٹکرا کے مر جاتی مجھ میں کہیں
پھڑ پھڑاتی ہوئی چیخ سینے کے پنجرے سے آزاد کی

گھومیے شامِ شہرِ بُتاں کی طلسمی چکا چوند میں
دیکھیے چلتی پھرتی تصاویرِ حسنِ خداداد کی

ہم بھی دیکھیں کہ آخر یہاں کون کتنا سخن فہم ہے
شرح کر کے دکھائے ذرا کوئی منظوم فریاد کی

کیا خبر، وہ خلا کی نہیں، خاکداں ہی کی مخلوق ہو
جس نے شبخون مارا ہے، دھرتی بُری طرح برباد کی

وقت پہلے سے موجود تھا، وقت کا اِستعارہ نہ تھا
ایک تقویم دریافت کی، دوسری ہم نے ایجاد کی

ذمہ داری قبول اُس نے کر لی مگر ساتھ یہ بھی کہا
شوخ جلووں پہ لوگوں کا گرنا خرابی ہے بنیاد کی

تجھ سے پہلے کے البم میں پرچھائیوں کے سوا کچھ نہیں
تُو ملے تو مَیں تصویریں تجھ کو دکھاؤں ترے بعد کی

زندگی دُھوپ کے رُخ بنائے گئے گھر میں محصور ہے
فرش جس کا ہے تانبے کا شاہد، فصیلیں ہیں فولاد کی

شاہد ماکلی

غزل

ہوش دن رات ڈھونڈتا تھا میں
اتنا مدہوش ہو گیا تھا میں

دائروں میں چراغ جلتے تھے
اور محور پہ جل رہا تھا میں

سبز ہونے میں وقت لگتا ہے
زرد شاخوں پہ کھل رہا تھا میں

لے کے دھاگے کئی مزاروں سے
ایک دوجے سے باندھتا تھا میں

میرے سینے پہ نقش ابھرتے رہے
اک زمانے میں راستہ تھا میں

لوگ سمجھے کہ کھو گیا ہوں کہیں
پسِ منظر چھپا ہوا تھا میں

منصور فائز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کس کو چھو کر ماہتابی ہو گیا
جھیل کا پانی شہابی ہو گیا

غزلیں

اپنا کوئی نہیں ہے جہانِ خراب میں
جیون گزر رہا ہے مسلسل عذاب میں

وقتِ رواں میں لوگ نہیں مانتے مجھے
قصے مرے پڑھیں گے میاں یہ نصاب میں

جب سے تمہارا ذکر ہوا گلستان میں
خوشبو تمہاری آنے لگی ہے گلاب میں

کوشش کے باوجود زباں سے نہ کہہ سکا
رکھتا تھا روز پھول میں اسکی کتاب میں

بے کار تم لگے ہو محبت تلاشنے
کچھ بھی نہیں ملے گا یہاں اس سراب میں

کب آئے گا وہ جس کا مجھے انتظار ہے
ہر لمحہ کٹ رہا ہے اسی اضطراب میں

فرخ گنوادی جس کے لیے یاں متاعِ جاں
میرا تو ذکر بھی نہ تھا اُس کی کتاب میں

سید فرخ رضا ترمذی

حال وہ عشق نے کیا میرا
اب نہیں خود سے رابطہ میرا

بچپنا جن کے سنگ گزرا تھا
اب کہاں ان سے واسطہ میرا

موت کا مجھ کو کوئی خوف نہیں
کون روکے گا راستہ میرا

میرے دشمن کو تو نہ شہہ دیتا
تجھ سے بس ہے یہی گلہ میرا

ربط رکھتا نہیں ہوں ظالم سے
کربلا سے ہے سلسلہ میرا

میرے قاتل تو میرے اپنے ہیں
کون مانگے گا خوں بہا میرا

کب مرا نام مٹ سکا فرخ
ذکر ہوتا ہے ہر جگہ میرا

غزل

پاس مرے وہ آ جاتا ہے
دل میرا بہلا جاتا ہے

مَے نینوں کی مجھے پلا کر
میری پیاس بڑھا جاتا ہے

کبھی کبھی تو لگتا ہے وہ
میرے جیسا ہُو جاتا ہے

پھر آؤں گا کہتے کہتے
باغ سبز دکھا جاتا ہے

اشک نہیں فاروقؔ ہیں رُکتے
ایسے گیت سنا جاتا ہے

زبیر فاروق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آئنے جان کے خاموش رہے ہیں خالد
ہم تو بے کار پشیماں ہوئے دلگیر ہُوئے

غزل

اک ایک کر کے پرندے چلے گئے، چپ چاپ
درخت چھوڑ کے سارے چلے گئے، چپ چاپ

ہم ان کا طرزِ تغافل کہیں کہ طرزِ ادا
وہ دھوم دھام سے آئے چلے گئے، چپ چاپ

کئی دنوں سے بہت خامشی ہے گلیوں میں
کہاں پہ گاؤں کے بچے چلے گئے، چپ چاپ

وہ بزمِ شعر میں آئے تھے گنگناتے ہوئے
مگر بیاض اٹھائے، چلے گئے، چپ چاپ

نہ جانے کتنے ہی احباب دار فانی سے
وفا کے دیپ جلائے، چلے گئے، چپ چاپ

کسی بھی شخص پہ افشائے راز ہو نہ سکا
وہ دل کا کرب چھپائے، چلے گئے، چپ چاپ

نہیں تھا آپ کو دانش سے اختلاف کوئی
تو کیوں بغیر بتائے چلے گئے، چپ چاپ

اعجاز دانش

غزل

بظاہر تو اجالے بانٹتے ہیں وہ زمانے میں
مگر مخلص نہیں اندر کی تاریکی مٹانے میں

چلو اے زندگی! جاؤ ملیں گے پھر کہیں دونوں
مجھے کچھ وقت لگ جائے گا خود کو آزمانے میں

میں کب کا پک چکا یارو! عوض میں اک تبسم کے
عبث مصروف ہو اب تم مری قیمت لگانے میں

جو کہتا تھا کبھی یک جان دو قالب ہیں ہم دونوں
وہ اب مصروف ہے کیوں درمیاں دیوار اُٹھانے میں

اگر اتنے میں مل جائے دلِ ناشاد کو فرحت
تجھے زحمت ہے کیا اے جاں! ذرا سا مسکرانے میں

میں چاہوں وہ اُجالے بانٹ دے میری شبِ غم میں
بضد ہے وہ مگر شمعِ محبت کو بجھانے میں

خفا ہر بات پر ہونے کی عادت پڑ گئی اُس کو
مجھے بھی لطف سا آنے لگا اس کو منانے میں

اکیلا رہ گیا ہوں وقت کے ہاتھوں میں اے فرحان!
بہت ہی دیر کر دی ہے کسی نے لوٹ آنے میں

سرور فرحان

غزل

قامت کو اس طرح سے بھی کم کر دیا گیا
مجھ کو مری ہی ذات میں ضم کر دیا گیا

پہلے تو صبر کی مجھے تلقین کی گئی
پھر زخم دے کے آنکھ کو نم کر دیا گیا

اہلِ کرم سے نظرِ کرم کے سوال پر
ہم ہی کو نذرِ اہلِ کرم کر دیا گیا

صد شکر میں سوال کی ذلت سے بچ گیا
صد شکر ایک اور ستم کر دیا گیا

دستِ ہنر نے اپنا ہنر کیا دکھا دیا
دستِ ہنر کو جڑ سے قلم کر دیا گیا

بازو کٹے تو میں نے بھی تدبیر سوچ لی
دستِ بریدہ ہی کو علم کر دیا گیا

جنت سی چند بستیاں پڑتی تھیں راہ میں
ان کو بھی وقفِ رنج و الم کر دیا گیا

مجھ میں جو ایک شخص تھا سیدھا سا، سادہ سا
اس کو اسیرِ دیر و حرم کر دیا گیا

جینے کا خوف مار ہی دیتا مجھے مگر
نادِ علی کو سینے پہ دم کر دیا گیا

مٹی میں مل کے مٹی میں جب ہو چکا تو پھر
کتبے پہ میرا نام رقم کر دیا گیا

کاٹی تھی عمر ایک جہنم کی قید میں
میری لحد کو باغِ ارم کر دیا گیا

علمدار حسین

غزل

درد بے باک تھے سکھ چین کو للکار چلے
سر اُٹھا کر مرے دل میں سبھی آزار چلے

اس طرح چلتا ہوں میں دل کی پکڑ کر اُنگلی
جیسے بیمار کو لے کر کوئی بیمار چلے

عشق کردار ہے معیارِ جہانبانی ہے
پھر بھی کہتے ہو کہ اس کھیل میں ہم ہار چلے

اپنی فطرت میں نہیں پیار جتاتے رہنا
اس کے ہم ساتھ تھے لیکن پسِ دیوار چلے

اپنی منزل بھی نہیں ایک مگر جانِ طلب
کتنے سادہ ہیں ترے ساتھ ہی ہر بار چلے

تم نے آلام کو تقسیم نہیں ضرب کیا
اور ہم ایسی فضا میں بھی سُبک بار چلے

ایک لمحے میں گزار آئے وصالِ یاراں
اب جدائی میں کہاں وقت کی رفتار چلے

وہ تو اس دل کی تڑپ نے ہمیں مجبور کیا
ہم کو معلوم تھا ہم ساتھ میں بیکار چلے

غم کی سوغات کو فیصل نے چھپا کر رکھا
جو ہیں نادان وہ لے کر سر بازار چلے

فیصل زمان چشتی

غزلیں

اسی پہ آنکھ ٹھہرتی ہے پیارا لگتا ہے
ہمیں جو دیکھ لے ہنس کے، ہمارا لگتا ہے

اسی کی بات سنے اور اسی کی بات کرے
ہمارے دل پہ اسی کا اِجارہ لگتا ہے

پھٹا لباس نہ دیکھ اس کی بات غور سے سن
مجھے وہ شخص محبت میں ہارا لگتا ہے

ادب میں عہدے نہیں، کام بولتا ہے میاں!
وہ ایک شخص اکیلے ادارہ لگتا ہے

جو شخص ڈوب رہا ہو شکستِ ذات کے بیچ
بھنور بھی دور سے اس کو کنارہ لگتا ہے

یہ شعر گوئی ہے یہ پارٹ ٹائم جاب نہیں
اور اس میں آدمی سارے کا سارا لگتا ہے

مَیں گہری نیند سے بیدار ہو گیا نازش
کسی نے خواب میں مجھ کو پکارا، لگتا ہے

شبیر نازش

ہماری آنکھ میں وحشت نہیں تو پھر کیا ہے
ہمیں یہ ہجر غنیمت نہیں تو پھر کیا ہے

دھڑک رہے ہیں بہم خوب صورتی سے جو ہم
ہمارے بیچ محبت نہیں تو پھر کیا ہے

یہ مسکرانا، ادائیں دکھانا، اٹھلانا
تری طرف سے سِفارت نہیں تو پھر کیا ہے

برنگِ اشک لہو آنکھ سے طلوع ہوا
اگر یہ دل سے بغاوت نہیں تو پھر کیا ہے

گزارنی ہے بہر حال سو گزاریں گے
جو زندگی میں سہولت نہیں تو پھر کیا ہے

ہمارا نام مٹانے پہ وہ لگے ہوئے ہیں
انھیں جو ہم سے عداوت نہیں تو پھر کیا ہے

ہمیں تمھاری ضرورت ہے دم بہ دم نازش!
تمھیں ہماری ضرورت نہیں تو پھر کیا ہے

غزل

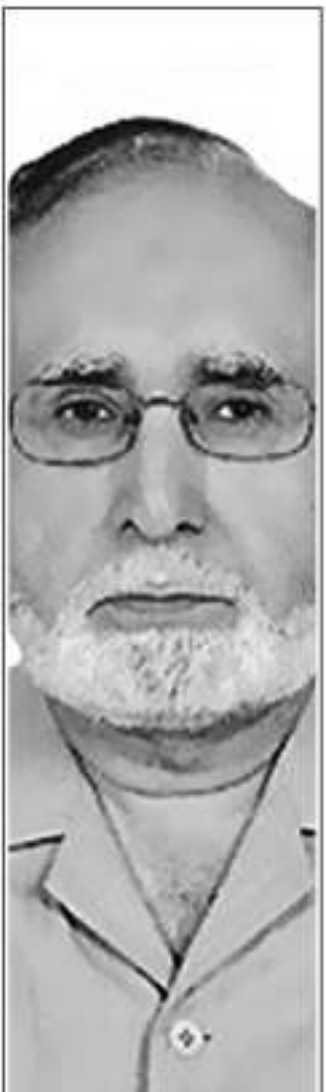

سبھی پوچھتے ہیں، یہ کیوں بولتا ہے
میں کب بولتا ہوں، جنوں بولتا ہے

لبوں کو ذرا بھی نہیں دیتی جُنبش
نگاہوں کا اُس کی فسوں بولتا ہے

یہ غربت کا مارا، یہ گونگا بچارا
بہت ہی ہو جب بے سکوں، بولتا ہے

سنو تم اِسے بھی، نہ اِس کو گراؤ
ریاست کا چوتھا ستوں بولتا ہے

غنیموں نے جس کا گلا کاٹ ڈالا
زمانے میں اس کا ہی خوں بولتا ہے

بتایا تھا دل کو کہ اب چُپ رہے وہ
مگر میں ضیؔا کیا کروں؟ بولتا ہے

سید ضیا حسین

غزل

خلقتِ شہر کہاں یار مجھے دیکھتی ہے
بس تری آنکھ لگاتار مجھے دیکھتی ہے

میں نے ہی گوشہ نشینی کو نہ چھوڑا ورنہ
آج بھی رونقِ بازار مجھے دیکھتی ہے

تیرا مقصود ہے اعلانِ معافی تو پھر
کیوں ترے ہاتھ کی تلوار مجھے دیکھتی ہے

ویسے تو فائدہ کوئی نہیں شب خیزی کا
صبح ہوتے ہوئے بیدار مجھے دیکھتی ہے

حالتِ وصل کے بعد ایسا لگا تھا مجھ کو
زندگی تیری طرح یار مجھے دیکھتی ہے

جب میں اُس شخص کے ہر ظلم پہ خاموش رہوں
چونک کر طاقتِ گفتار مجھے دیکھتی ہے

ہجر کے آخری زنداں میں مقید ہوں جہاں
در نہیں دیکھتا دیوار مجھے دیکھتی ہے

ہاتھ بڑھ جائے اگر لقمۂ تر کی جانب
نسبتِ حیدرِ کرار مجھے دیکھتی ہے

اپنی محرومی کسی طرح چھپا سکتا نہیں
ایسے وہ شاخِ ثمر دار مجھے دیکھتی ہے

ایک اُس شخص نے جانے نہیں دیکھا مجھ کو
ورنہ دنیا تو کئی بار مجھے دیکھتی ہے

ازور شیرازی

غزلیں

سمندر آنکھ میں رکھا ہوا ہے
محبت میں کہاں گھاٹا ہوا ہے
کھلیں گے پھول تو آ جائے گی وہ
خزاں نے گھر مرا دیکھا ہوا ہے
ملی ہے صاحباں اور ہیر کس کو
کوئی مرزا کوئی رانجھا ہوا ہے
ابھی تک جاگتی ہے شاہ زادی
محل میں ہر کوئی سویا ہوا ہے
پہیلی کی طرح ہیں اُس کی آنکھیں
نجانے دل میں کیا رکھا ہوا ہے

وسیم جبران

ہُوا کیا دن اگر ڈوبا ہوا ہے
ستارہ شام کا نکلا ہوا ہے
میں جس کو ڈھونڈتا ہوں شہر بھر میں
وہ ملنے گھر مرے پہنچا ہوا ہے
انوکھے ضابطے ہیں عشق کے بھی
جو ہارا ہے وہی جیتا ہوا ہے
مجھے ڈالا ہے تم نے امتحاں میں
سبق لیکن مجھے بھولا ہوا ہے
نکلنا تھا مجھے تم سے ہی ملنے
تم آئے ہو بہت اچھا ہوا ہے

خدارا اب تو مشکل سے نکالو
کہ پانی سر سے اب اونچا ہوا ہے
مجھے درپیش ہے پھر سے سفر اک
مجھے پھر شام نے گھیرا ہوا ہے
مجھے مل جاؤ گی تم اک نہ اک دن
دعاؤں میں تمہیں رکھا ہوا ہے

تمہاری سمت سے آیا ہے بولو
یہ پانی کس طرح گدلا ہوا ہے
جوانی نے نچوڑا خون سارا
بدن اب سوکھ کر کانٹا ہوا ہے
کرو جبران کچھ اب دل ہمارا
تمہارے ہاتھ میں رکھا ہوا ہے

غزل

کتنا عجیب شخص تھا کیا کام کر گیا
اپنی اُداسیاں بھی مرے نام کر گیا

عزت مآب لوگ تھے ہم اپنے شہر میں
تیرا بچھڑنا ہم کو مگر عام کر گیا

نکلوں میں اُس کے سحر سے ممکن نہیں رہا
مُجھ کو وہ عُمر بھر کے لیے رام کر گیا

آواز ہر طرف سے اُسی کی سُنائی دے
ظالم فضائے شہر کو پیغام کر گیا

اب میں ہُوں اور ماتمِ فُرقت ہے رات دِن
کیا کیا وہ میری ذات پہ انعام کر گیا

دُشوار تھا جہاں کا اگرچہ سفر بہت
لیکن ترا کرم رہا بسرام کر گیا

مہتاب کے سفر کا کیا اُس نے قصد اور
قاتل مری حیات کو بدنام کر گیا

عمر قیاز قائل

غزل

تشنہ گزار طبعِ وضاحت اسے بھی تھی
کیسے یقیں کروں کہ محبت اسے بھی تھی

تتلی مزاج تھی وہ، سو کھل کے نہ جی سکی
پر نوچتی ہواؤں سے وحشت اسے بھی تھی

اک میں نہیں تھا شہرِ خرابہ پہ حرف زن
اجڑی ہوئی گلی سے شکایت اسے بھی تھی

اک مرہمِ ملال رہا مجھ کو پیش پیش
اک زخمِ خوش جمال کی حسرت اسے بھی تھی

دل جل رہا تھا آگہی کی تیز دھوپ میں
اپنے کیے پہ سخت ندامت اسے بھی تھی

یہ اور بات چاک مرے اَن سلے رہے
ورنہ رفو گری میں مہارت اسے بھی تھی

کچھ اس لیے بھی کارِ محبت کیا شروع
"مصروف میں بھی کم تھا فراغت اسے بھی تھی"

پتھر ہے کس لیے وہ کوئی التجا سنے
جب تک خدا رہا تھا، اذیت اسے بھی تھی

زنداں نے عمر بعد کیا مجھ پہ انکشاف
زنجیر کی کڑی سے کراہت اسے بھی تھی

احمدؔ سے بے سبب رہے سقراط سب خفا
سچ بولنے کی تھوڑی بہت لت اسے بھی تھی

احمد محسود

غزل

سینے پہ لگے ہیں جو ترے ہجر میں چُر کے
روشن ہیں ستاروں کی طرح زخم جگر کے

برباد شب و روز ترے عشق میں کر کے
کونے میں پڑا رہتا ہوں اب اپنے ہی گھر کے

بھاری ہیں بہت تارِ تنفس پہ خداوند
پتھرائے ہوئے اشک مرے دیدۂ تر کے

اک میں ہی نہیں ہوں تری آنکھوں کا پجاری
شیدائی دو عالم ہیں تری مست نظر کے

اے جانِ حیا ایک نظر میری طرف بھی
کندن سا ہوا ہوں میں ترے ہجر میں مر کے

اک روز یہ ٹوٹے ہوئے دل جوڑیں گے مظہر
پروردہ یہ اشعار ترے دستِ ہنر کے

مظہر حسین مظہر

غزل

میں نے غم پیار کے سینے سے لگائے رکھے
اور قدم اہلِ زمانہ سے ملائے رکھے

ہم سرِ راہ پڑے ہیں تو خدا ہی جانے
وہ ہمیں دیکھ کے مٹی سے اٹھائے، رکھے؟

اس سے کہنا کہ زمانے کی زباں مت بولے
اس سے کہنا کہ کوئی اپنی بھی رائے رکھے

ہاتھ دل پر وہ رکھے گا تو قرار آئے گا
اس سے کہیے گا کسی روز وہ آئے، رکھے

جانے کب چھین کے لے جائے نشانی اپنی
سر پہ کب تک وہ بھلا یاد کے سائے رکھے

بس خزاؤں سے سدا اپنا سروکار رہا
بس تصور میں سدا پھول کھلائے رکھے

اک فقط اپنے بھی ہوتے تو بہت تھے لیکن
بوجھ اوروں کے بھی کاندھے پہ اٹھائے رکھے

اس کا ملنا تو مقدر میں نہیں ہے لیکن
عمر بھر آس کی شمع تو جلائے رکھے

عنبرین خان

غزل

وہ چارہ گر ، وہ مرا غم گسار بھول گیا
وفائیں بھول گیا ، میرا پیار بھول گیا

سمجھ رہی تھی کہ وعدے کا پاس ہوگا اسے
مگر وہ شخص تو قول و قرار بھول گیا

کسی نے یاد دلایا تو یاد آیا اُسے
ذرا سی دیر رہا شرم سار ، بھول گیا

اب اس کو یاد نہیں ہے وہ رُت محبت کی
بہار بھول گیا ، برگ و بار بھول گیا

بس ایک دُکھ، مجھے بھولا ہے وہ کسی کے لیے
چڑھا جو پیار کا اس پر خمار بھول گیا

ہزار بار دلاتی رہی میں یاد اس کو
اک آدھ بار نہیں بار بار بھول گیا

جو کہہ رہا تھا نہ بھولوں گا میں تجھے شفقت
پھر ایک دن مجھے بے اختیار بھول گیا

شفقت حیات شفق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کم نظر روتے رہے ہم نظروں کا رونا
دیکھتا کون ترے دیدہ وروں کا رونا

غزل

زندگی کو ڈھونڈتی ہے زندگی
کھیل کیسا کھیلتی ہے زندگی

راستے میں عشق کے انسان کو
سچ بہت ہی رولتی ہے زندگی

جب بھی بدلوں راستہ اس سے کبھی
راہ میں آ روکتی ہے زندگی

بددعا ہے جانے کس کی دل کو یہ
کس کا بویا کاٹتی ہے زندگی

گھوم پھر کے آ رکی ہے پھر وہیں
دائروں میں گھومتی ہے زندگی

نائلہ راٹھور

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر فاصلہ بڑا ہے ، ہر مرحلہ کڑا ہے
سورج اگر ہے پیچھے ، سائے کے ساتھ ہو لو

غزلیں

بنا مطلب کے آئے ہیں محبت ساتھ لائے ہیں
ہمیں نے رات دن جاناں وفا کے گیت گائے ہیں

تمہارے شہر میں ہر سو فقط تھا گھور اندھیارا
ہمیں نے خون دل دے کر سبھی دیپک جلائے ہیں

میری ہر راہ پر ہر ہر قدم کانٹے بچھاتا ہے
جسے دھرتی پہ چلنے کے ہنر میں نے سکھائے ہیں

خالق آرزو

راہ یہ اختیار مت کرنا
تم پرندے شکار مت کرنا

آج ہی مان لو محبت کو
زندگی بیقرار مت کرنا

مل ہی جائے گا خلد کا رستہ
مال و دولت سے پیار مت کرنا

جنگ میں کوئی بھی مقابل ہو
کبھی چھپ چھپ کے وار مت کرنا

نہ اپنی ماں کی الفت کو نگاہ شک سے تم دیکھو
پلایا دودھ تم کو جس نے ٹکڑے خشک کھائے ہیں

جفا کی آرزو، خالق ہمیں غیروں سے کیا ہوگی
ہمارے خون نے ہم پر ستم سارے ہی ڈھائے ہیں

جام کوثر کی آرزو ہے اگر
پھر یزیدوں سے پیار مت کرنا

کرنا ہر سانس اس کے نام مگر
پھر وہ سانسیں شمار مت کرنا

تیرے خالق کی آرزو ہے خدا
اس کو عالم میں خوار مت کرنا

غزل

کچھ اس طرح کا عجب امتحان دینا پڑا
مجھے زمیں کے عوض آسمان دینا پڑا

تُو جانتا ہی نہیں دینِ مصطفیٰ کیا ہے
حُسین جانے جسے خاندان دینا پڑا

وہ بے نشان تھا لیکن مرے توسّط سے
پھر اپنے ہونے کا اس کو نشان دینا پڑا

وہ جانتا ہے تری اک نظر کی قیمت کو
کہ دل کے ساتھ جسے اک جہان دینا پڑا

جو مجھ پہ اپنے ہی لشکر سے تیر آنے لگے
عدو سے ہٹ کے محافظ پہ دھیان دینا پڑا

سمٹ رہا تھا مرا سایہ دھوپ کے ڈر سے
دہکتے سائے کو پھر سائبان دینا پڑا

بھٹک رہا تھا ہتھیلی پہ لے کے اپنا شباب
مجھے پھر اس کو یہ دل کا مکان دینا پڑا

علی رضا بلوچ

غزلیں

رکھتے ہیں گفتگو میں غضب کی مٹھاس ہم
جس دن سے ہو گئے ہیں زمانہ شناس ہم

بھرپور روشنی تھی وہ شدت کا لمس تھا
دیکھا، چھوا تو پل میں ہوئے بے حواس ہم

کتنے حسین رشتے نبھائے ہیں تیرے بعد
اب اور کیا کہیں تجھے آئے نہ راس ہم

ہم اک پری کے خواب کی تعبیر کم نما
صد رنگ داستاں کا کوئی اقتباس ہم

تیری تلاش خود سے بہت دور لے گئی
اب خود کو ڈھونڈتے ہیں ترے آس پاس ہم

محمد مسعود اختر

پرانے دستور میں یہ ترمیم چاہتا ہوں
سماج میں ہر بشر کی تکریم چاہتا ہوں

مرے قبیلے میں اس لیے میری دشمنی ہے
میں بچیوں کے لیے بھی تعلیم چاہتا ہوں

چراغ حیرت جلا کے ڈیرا لگا لیا ہے
میں دشت میں آگہی کی اقلیم چاہتا ہوں

فلک پہ مسجود رہ چکا ہوں۔۔۔ پس اے فرشتو
زمین پر بھی ذرا سی تعظیم چاہتا ہوں

ہم تشنگی پسند قبیلے کے فرد ہیں
سیراب ہو گئے تو گنوا دیں گے پیاس ہم

پھرتے ہیں خوار جائے اماں کی تلاش میں
آوارگانِ خطۂ خوف و ہراس ہم

اختر یہ ابتدائے محبت کا فیض ہے
کچھ دن سے ہو گئے ہیں بہت خوش لباس ہم

تمھاری آنکھوں کو غور سے دیکھنا پڑے گا
میں ایک تازہ غزل کی تفہیم چاہتا ہوں

مری زمینوں کی پیاس کا انتظام کر دو
میں پانیوں کی درست تقسیم چاہتا ہوں

نہ کن کی قدرت، نہ شعر پر دسترس ہے، پھر بھی
مرے تخیل، میں تیری تجسیم چاہتا ہوں

غزل

اِک اشارہ ہے کن فکاں کا یہاں
نام چلتا ہے آسماں کا یہاں

بے ضرر سی شدید خواہش پر
کیا بھروسا ہے بدگماں کا یہاں

اُس کو میرا سلام کہیے گا
روز آنا ہے مہرباں کا یہاں

زندگی کے ہزار خانوں میں
رنگ بکھرا ہے خاکداں کا یہاں

سب سہولت سے یاد آتے ہیں
رشتہ مضبوط رفتگاں کا یہاں

میں تو دریا میں کود جاتا ہوں
کب سہارا ہے بادباں کا یہاں

تم اکیلے اِدھر نہیں آئے
نقش باقی ہے کارواں کا یہاں

راستے بند ہو گئے بابر
وقت آیا ہے امتحاں کا یہاں

امجد بابر

غزل

میں انتظار بہت انتظار کرتا رہا
وہ بیقرار بہت بیقرار کرتا رہا

ہر اک کی بانہوں میں عادت تھی اسکو جھولنے کی
وہ شرمسار بہت شرمسار کرتا رہا

برائے نام محبت کے ہم نہیں قائل
وہ یار یار بہت یار یار کرتا رہا

مجھے بھی اس سے کوئی خاص عشق تھا ہی نہیں
وہ اعتبار بہت اعتبار کرتا رہا

کیفی قلندر

رفوگری میں، میں ماہر ہوا اسی کے سبب
وہ دل فگار بہت دل فگار کرتا رہا

بچا نہ پایا میں اس سے یہ دامن الفت
وہ تار تار بہت تار تار کرتا رہا

غزل

چپ چاپ تجھے چھوڑ دوں ایسا بھی نہیں میں
ہاں ٹھیک ہے اچھا ہوں پر اتنا بھی نہیں میں

میں کون ہوں کیا چیز ہوں کچھ علم نہیں، دوست
اس کا بھی نہیں تیرا بھی اپنا بھی نہیں میں

تجھ سے نہیں اُمید تو کچھ بات تو ہے ناں
ہر ایک سے مایوس تو ہوتا بھی نہیں میں

کیا لوگ تھے جو مجھ کو سمجھتے رہے آقا
آقا تو بڑی بات ہے بندہ بھی نہیں میں

آنکھوں میں تری لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں
حالانکہ ترے سامنے آیا بھی نہیں میں

یہ غم ہی کسے ہے کہ مجھے مل نہ سکا تو
غم یہ ہے ترے ہجر میں تڑپا بھی نہیں میں

الجھاؤ نہ دیکھوں ترا، پاگل تو نہیں ہوں
بدلاؤ نہ دیکھوں ترا، اندھا بھی نہیں میں

امتیاز انجم

غزل

اِک دفعہ سلسلہ شروع ہوا
پھر کہاں عشق میں رجوع ہوا

داستاں اور ہی سنائی گئی
واقعہ اور ہی وقوع ہوا

گفتگو کا کوئی اصول نہیں
نِت نیا مسئلہ فروع ہوا

عشق کا سجدہ بھی ادا ہو گا
ابھی پُورا نہیں رکوع ہوا

وہی معمول کی ہے صبح امر
نیا سورج کہاں طلوع ہوا

امر مہکی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

باندھا گیا ہے جسم کے پتّھر سے کیوں مجھے
نفرت ہے آپ اپنے ہی پیکر سے کیوں مجھے

غزلیں

ملتے جو رہے سب نے کہا عید مبارک
پر اُس کی تھا آنکھوں میں جدا عید مبارک

بچّوں کے جو ہاتھوں پہ سُہانی سی مَہک ہے
ہنستے ہوئے کہتی ہے حِنا عید مبارک

کچھ شیخ نے گرمایا ہے ایمان بھی ایسے
کہنے لگی شُعلوں سے ہوا عید مبارک

کلیاں تھیں جواں اور حیا رسمِ گلستاں
پھولوں نے بھی بھنوروں سے کہا عید مبارک

چمکی ہیں ضیا بار مہِ نو سے دشائیں
ذروں سے بھی کہتی ہے فضا عید مبارک

پُھولوں نے جو پہنی تھیں تبسّم کی قبائیں
کہنے لگی خُوشبو سے صبا عید مبارک

ملنے کا شہاب اُس کا ارادہ تو نہیں تھا
رسماً ہی ملا مجھ سے، کہا عید مبارک

شہاب اللہ شہاب

اس زندگی میں کل نہیں اک لمحہ بھی جناب
آنکھیں ابھی کھلی نہ تھیں رخصت ہوا شباب

اک سمت دشتِ بے کراں اک سمت پھل کا باغ
یعنی کہ مرگ و زیست میں کرنا تھا انتخاب

دریائے دل میں کر گیا طوفان سا بپا
دیکھا تھا میں نے ایک دن اس چھت پہ ماہتاب

کوئی پڑھا سکا نہ جو اس نے پڑھا دیا
وا ہو گیا تھا مجھ پہ جو وہ چہرۂ کتاب

ہم کو ڈرا نہ شیخ تو میدانِ حشر سے
ایسا تو روز دیتے ہیں دنیا ہی میں حساب

دعویٰ ہے میرا خاک وہ ہو جائے مثلِ طور
جو آنکھ بھر کے دیکھ لے کس میں ہے اتنی تاب

غزل

جو زخم لگائے انھیں بیدار نہ کرنا
ملنے مجھے آئے ہو تو تکرار نہ کرنا

آنکھوں سے عیاں پیار کی بہتی ہوئی ندیاں
اُس پر یہ ترا بول کے اظہار نہ کرنا

اب دل کو سنبھلنے میں ذرا وقت لگے گا
اب اور اسے رنج سے دوچار نہ کرنا

میدان میں للکار کے دشمن کو بلانا
چھپ کر کبھی بزدل کی طرح وار نہ کرنا

اخبار ، رسالے ، یہ کتابیں مرے بچّو!
بس دھیان سے رکھنا ، انھیں بے کار نہ کرنا

رانا محمد شاہد

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آنکھ سے ضبط کے پھول جھڑ جائیں گے
دیکھ لینا ہم اک دن اُجڑ جائیں گے

غزلیں

مفہوم جب تک اُن سے گھمایا نہیں گیا
باتوں میں اُن کی ہم سے بھی آیا نہیں گیا

نشو و نما ہو کیسے ہمارے وجود کی
ہم سے ترا فریب بھی کھایا نہیں گیا

خود آ گیا تو اس لیے رکھنا پڑا اِسے
یہ شعر کھینچ تان کے لایا نہیں گیا

پایا نہیں گیا جو رہا ہم کو دستیاب
اور گم ہوا تو ہم سے گنوایا نہیں گیا

یاروں کی بے رخی ہے یقیناً عروج پر
کب سے مرا مذاق اُڑایا نہیں گیا

رضی رضوی

صحیفہ پڑھ رہا ہوں بے بسی کا
تعاقب کر رہا ہوں تیرگی کا

اُٹھو یارو جہانِ کُن فکاں میں
بڑھائیں اور رتبہ آدمی کا

مرے سر کو رکھو شانے پہ کچھ دیر
ہو کم دورانیہ آشفتگی کا

تمہاری سمت کیسے لوٹ آؤں
ارادہ ہی نہیں ہے واپسی کا

ہمارے بخت میں لکھا نہیں ہے
کوئی لمحہ زمانے نے خوشی کا

یہ کیسی خواہشِ ناکام ہے جو
مجھے ہونے نہیں دیتی کسی کا

عدنؔ اَعصاب پر طاری جنوں کو
بنانا مسئلہ مت زندگی کا

شعیب عدن

غزلیں

بس وہی زندگی سے واقف ہے
جو دیا روشنی سے واقف ہے

پھر تجھے بولنا بھی آئے گا
تو اگر خامشی سے واقف ہے

اور تو کوئی سوجھ بوجھ نہیں
دل مگر دل لگی سے واقف ہے

اس لیے آدمی سے ڈرتا ہے
آدمی آدمی سے واقف ہے

ٹھیک سے جس کو جانتا ہی نہیں
دل بھی کس اجنبی سے واقف ہے

خود کو سیراب کر نہیں سکتی
آنکھ اپنی نمی سے واقف ہے

محمد علی ایاز

سامنے آپ کے اک روز بٹھایا جاتا
ایک رشتہ تھا سو رشتے کو نبھایا جاتا

چاند راتوں کو تری دید سے روشن کر کے
عید کا دن بھی ترے ساتھ منایا جاتا

یہ بھی ممکن تھا تری زلف کی زینت ہوتا
یہ بھی ممکن تھا مجھے دل میں سجایا جاتا

میں بھی وہ شخص نہیں تھا جو بھلایا جاتا
تو بھی وہ شخص نہیں تھا جو گنوایا جاتا

زین ہم خاک نشینوں پہ یہی لازم تھا
خاک تھے ہم، سو ہواؤں میں اُڑایا جاتا

زین علی رضوی

غزل

یہ جو دو چار قدم باقی ہیں
یوں سمجھ لو کہ ستم باقی ہیں

معذرت میں نے وصولی سے کی
وہ تو کہتے ہیں کرم باقی ہیں

راہ میں وہ بھی ٹکر جاتا ہے
دوستی تیرے بھرم باقی ہیں

تجھ کو دیکھے پہ جو مچایا اُدھم
جمع در جمع اُدھم باقی ہیں

ہر جگہ ڈھونڈ لیا یاروں کو
بس عرب اور عجم باقی ہیں

خار چن لوں گا میں اے اُم جمیل
بولہب تیرے ستم باقی ہیں

تیرا اعجاز ہے جانے والا
کر عطا جو بھی درہم باقی ہیں

اعجاز رضوی

فطرانہ

ستائیس رمضان المبارک کو عصر کے وقت ضعیفہ خبیر کے گھر آئی۔ جو کہ خبیر کی ہم سائی بھی تھی اور رشتہ دار بھی۔ دعا سلام اور خیریت دریافت کرنے کے بعد وہ خواتین کے ساتھ مہنگائی افطاری اور عید کے رسمی موضوعات پر گفتگو میں مصروف ہو گئی۔ کچھ دیر بعد گھر جانے لگی خواتین سے اجازت چاہی کہ روزے کا وقت گزارنے آئی تھی۔ جاتے ہوئے اس نے خبیر کو سلام کیا۔ اور دبے لفظوں میں اشارتاً" فطرانے کا ذکر کیا۔

خبیر نے کہا۔ ہاں آج جمعہ الوداع کے موقع پر امام صاحب نے اسی موضوع پر بڑی تفصیل سے بات کی ہے۔

ضعیفہ نے کہا خبیر تمہیں خبر ہے ہم مفلس بھی ہیں، نادار بھی ہیں حق دار بھی تمہارے رشتہ دار بھی۔

ہاں آج مولوی صاحب نے کہا ہے اول خویش بعد درویش"

ضعیفہ نے کہا۔ خبیر اول خویش--- کا کیا مطلب ہے؟

خبیر نے کہا اس کا مطلب ہے پہلے اپنے اور بعد میں کوئی اور ضعیفہ نے معصومیت سے کہا۔ ہم تمہارے اپنے نہیں، تمہارے رشتہ دار نہیں؟ ہر لحاظ سے حق دار نہیں

خبیر نے توقف کرتے ہوئے کہا۔ ہاں یہ بات تو ہے مگر---

ضعیفہ: مگر کیا

خبیر: ماں جی تمہارا بیٹا تو ہماری پرواہ بھی نہیں کرتا۔ بس سرسری دعا سلام کر کے گزر جاتا ہے۔ تم حق دار کیسے ہوئے

وہ عیار---اور اس کا سارا خاندان، جس کو میں جانتا بھی نہیں ہوں۔ بڑا تابع فرمان ہے۔ ہمیشہ جھک جھک کے ملتا ہے۔ سارا سال سلام کرتا ہے۔ گھر کے سب خدمت کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔ میں تمہاری رشتہ داری کو کیا کروں۔ میں تو اس کو فطرانہ دوں گا جو کہ میری دید کرے گا عید کرے گا۔

☆☆☆☆☆

عاصم بخاری

اولڈ کیمپس کی محبت

کہنے لگی ڈھول کی تھاپ پر ناچتے ہوئے گھوڑے اور عشق کے سرور میں رقص کرتے ہوئے عاشق میں بہت فرق ہوتا ہے----

رقص تو رقص ہوتا ہے--- میں اس کی بات کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہوئے بولا---

تم نے کبھی دھمال ڈالتا ہوا ملنگ دیکھا ہے

--وہ میری بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولی---وہ سیکھے بنا اپنے جنون سے ناچتا ہے

---وہ بے نیاز ہوتا ہے محبوب کی رضا سے

---اسے اس کا جذب نچاتا ہے

پتہ نہیں --- کالج کی لہریا سڑک کے کنارے چھوٹی سی دیوار پر اس کے ساتھ بیٹھ کر بدلیوں میں چھپتے سورج کو دیکھتے ہوئے میں دھیرے سے بولا ---

تیس سال تمھارے عشق کے وجد میں مدہوش گزر گئے ----میں تلخی سے اپنا مدعا بیان کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا

---اور اب تم کہتی ہو میری زندگی بھر کا جنون سدھائے ہوئے گھوڑے کے ناچ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا ---- ----

--- تمھارے خیال میں عشق ہوتا تو مجھے ہوش ہی نہیں رہنی چاہیے تھی--- میں اپنی لے میں جانے کیا کیا بولتا رہا لیکن میں چاہتے ہوئے بھی اس سے یہ نہ کہہ سکا کہ مجھے گھر بھی چلانا تھا اور کام بھی کرنا تھا-----

میں عشق کا جوگ لے کر کسی دربار کا مجاور کیسے بنتا ---- بہت دیر تک بڑبڑانے کے بعد میں اپنا لہجہ دھیما کرنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا

عشق دربار کا محتاج نہیں --- لیکن تم کہاں سمجھو گے ---اس نے دھیرے سے سرگوشی کے انداز میں کہا

مجھے واقعی کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی-- میں اس کا سرد ہاتھ تھام کر دسمبر کے آخری دنوں کی نرم دھوپ کو بدلیوں کے درمیان چھپتے ہوئے سورج کے ساتھ آنکھ مچولی کرتے ہوئے

حبیب الرحمٰن

دیکھنے لگا - کلاس کی ری یونین میں اکھٹے ہونے والے ہم جماعت دوپہر کے کھانے کے بعد کب کے رخصت ہو چکے تھے۔

ہم راولپنڈی میڈیکل یونیورسٹی کے اولڈ کیمپس کی لہریا سڑک کے ساتھ بنی چھوٹی سی دیوار پر ٹانگیں لٹکائے گزرے دنوں کو یاد کر رہے تھے - دسمبر کے آخری دنوں کی سرد دوپہر میں کبھی کبھی نظر آنے والا سورج ہمارا ساتھ دینے کی کوشش کرتے ہوئے کبھی بدلیوں میں گم ہوتا تو کچھ دیر کے لیے خاموشی ہمیں گھیر لیتی - ہمارے سامنے سے گزرتی لہریا سڑک کے پار برسوں پرانا فٹ بال گراؤنڈ تھا - ہمارے عقب میں چھوٹے سے لان کے پار مرکزی عمارت تھی - ہمارے دائیں جانب ٹیپو روڈ اور عمارت کا مین گیٹ تھا - لہریا سڑک بائیں جانب گزرتے ہوئے دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی ایک حصہ ہمارے زمانے کے ہوسٹل نمبر دو کی جانب مڑتا اور دوسرا آڈیٹوریم اور بس سٹینڈ پر اختتام پذیر ہوتا۔

کالج کی اس عمارت کو اب اولڈ کیمپس کہتے ہیں --- میں اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے بولا --اس کی مخروطی انگلیاں سرد اور خاموش تھیں --نیا کیمپس یہاں سے ہولی فیملی چلا گیا ہے--اس کے لیے شائد یہ معلومات نئی نہیں تھیں مگر اس نے مجھے نہیں روکا--

تمھیں کبھی یاد بھی آیا کہ میں کہاں ہوں زندہ بھی ہوں یا نہیں --اس نے اپنی بات جاری رکھی---

بھولنے کی کوشش میں ہی تو نگر نگر بھٹکتا رہا ---میں صفائی دینے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے بولا-

پتہ نہیں --اس نے بے یقینی سے میری جانب دیکھا اور چپ ہو گئی ---اس کے گہرے سیاہ ریشمیں بال برسوں پہلے کی طرح اب بھی اس کے گالوں سے اٹھکیلیاں کر رہے تھے - اس کی آنکھیں اب بھی بولتی تھیں لیکن انہیں مدھم سے دائرہ نما سیاہ حلقوں نے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا- اس کی ناک کا ایک جانب کا تل جو اس کا ٹریڈ مارک ہوا کرتا تھا اب جانے کہاں کھو گیا تھا اس کے ہونٹ اتنی صدیاں گزر جانے کے باوجود اب بھی کچھ کہنے سے پہلے تھرتھراتے ہوئے محسوس ہوتے ----

میں بہت بار یہاں آیا ہوں --- میں اپنی بات دوبارہ شروع کرتے ہوئے بولا--- جب بھی اپنے شہر میں دم گھٹتا تھا میں یہاں آجاتا--- گیٹ سے ہاسٹل اور آڈیٹوریم تک جاتی ہوئی اس لہریا سڑک کے کنارے پتھروں کی بنی اس چھوٹی سی دیوار پر ہمیشہ میں نے تمھیں تلاش کیا یہ جانتے ہوئے بھی

کہ تم مجھے یہاں کبھی نہیں ملوگی---

اس نے بے یقینی سے میری جانب دیکھا اور ماتھے پر آئی ہوئی لٹ کو پیچھے کرتے ہوئے دور کہیں دیکھنے کی کوشش کرنے لگی--

مری روڈ سے ٹیپو روڈ کی جانب مڑ کر کچھ بھی پہلے جیسا نظر نہیں آتا-- میں نے اپنی بات ایک بار پھر شروع کی-- میٹرو بننے سے وہ اپنائیت کا احساس ہی نہیں رہا جو مری روڈ سے وابستہ تھا-- ٹیپو روڈ دو رویہ ہوگئی---- وہ سوزوکیاں جو اس زمانے میں سڑک کے کونے میں کھڑی ہوا کرتی تھیں اب نظر نہیں آتیں --- مری روڈ اور کالج کے درمیان بے سنیما ختم ہوگئے ------

تمہیں پتہ ہے موتی محل کے ساتھ نئی سڑک پر فریادی کا ہوٹل ہوا کرتا تھا--- میں اس کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتے ہوئے پتہ نہیں کیا کیا کہتا رہا اور وہ خاموشی اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں کچھ تلاش کرنے کی کوشش کرتی رہی------

تم نے کبھی مجھے تلاش کرنے کی کوشش کی --اس نے کن انکھوں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا---- تا تنگ ہوتی تو محبوب کی خبر بھی رکھتے-- اس نے آنکھوں کو ٹشو سے صاف کرتے ہوئے کہا

میرے پاس اس کی باتوں کا کوئی جواب نہ تھا --- خاموشی ایک بار پھر کچھ دیر کے لیے ہمارے درمیان حائل ہوچکی تھی-

تمھاری شادی کا پتہ چلا تھا -- میں نے اپنی صفائی پیش کرنے کی ایک اور کوشش کرتے ہوئے کہا-- پھر امریکہ روانگی کی خبر ملی --- --- چکور کی طرح ہلکان ہوتا رہا اور آگ کی چنگاریوں سے خود جلاتا رہا--

جنگل میں ناچتے مور کو کون دیکھ سکتا ہے ---وہ میرے کاندھے پر سر رکھ کر ایک بار پھر چپ ہوگئی

تمہیں پتہ ہے مری روڈ سے پیدل آتے ہوئے آج بھی کالج کی دیوار شروع ہوتے ہی تمھاری ایک جھلک دیکھنے کو من مچلنے لگتا ہے-- میں ایک بار پھر اسے برسوں سے نہ کہی جانے والی باتیں کہنے کی کوشش کر رہا تھا --- کالج کی دیوار اب کچھ اونچی ہوگئی ہے دیوار کے پار کچھ بھی نظر نہیں آتا- کالج کا گیٹ جو ہمارے زمانے میں ہر وقت کھلا رہتا تھا اب بند رہتا ہے- ہم دونوں پتہ نہیں کیا کیا کہتے ہوئے پتھروں کی اس چھوٹی سی دیوار پر کتنی ہی دیر تک بیٹھے بکھرے ہوئے لمحوں کی راکھ میں آگ تلاش کرتے رہے

دیوار کے عقب میں ہمارے زمانے کا پرنسپل آفس اب وائس چانسلر کا دفتر بن گیا ہے-- میں نے پیچھے دیکھتے ہوئے اپنی بات دوبارہ شروع کرتے ہوئے کہا -- عمارت

اور دیوار کے بیچ میں قائم چھوٹا سا لان اور کیاری برسوں بعد بھی اسی طرح قائم ہے۔ ہجر کے دنوں میں اس کیاری میں کھلتے پھول مجھے زہر لگتے تھے --- میں نے جھک کر کیاری میں کھلتے پھولوں کو چھونے کوشش کرتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

اس نے ایک بار پھر --- پتہ نہیں کہا--- اور بے یقینی سے میری جانب دیکھتے ہوئے چپ ہوگئی۔

آڈیٹوریم کے باہر ایک بھی بس ہمارے زمانے کی نہیں--- خالی خولی نظروں سے وہ سارے منظر کو دیکھتے ہوئے بولی --

ہاں--- میں نے اس کے اڑتے ہوئے بالوں کے درمیان سے جھانکتی نیلے رنگ کی کالج بسوں کو دیکھتے ہوئے کہا------

تمھیں یاد ہے شروع شروع میں اسلام آباد سے (GTS) سرکاری ٹرانسپورٹ کی بس آیا کرتی تو ہم اپنی کالج بس کے لیے کتنا پرشور مطالبہ کیا کرتے تھے۔ جی نائن کراچی کمپنی پارک روڈ میلوڈی آبپارہ اور پتہ نہیں کہاں کہاں سے ہوتی ہوئی وہ بس کالج پہنچتی تو ہم کھڑے رہ رہ کے ہلکان ہو چکے ہوتے۔ پھر کالج کی اپنی نئی نئی بسیں آ گئیں پھر ان کے روٹ بدل گئے پھر شائد وہ بھی بدل گئیں اور اب ان میں سے کوئی بس بھی نظر نہیں آتی تو کتنا عجیب لگ رہا ہے--

تمھیں بس کی اپنی مخصوص نشست یاد ہے --- میں نے ایک بار پھر اس کا ہاتھ تھام کر سوال کیا

دروازے کے ساتھ والی --- اور تم اس تمام سفر میں دروازے میں کھڑے ہو کر کتنی اوٹ پٹانگ حرکتیں کیا کرتے تھے --- وہ کسی پرانے لمحے کو یاد کر بے ساختہ ہنس دی --- کتنی ہی دیر ہم بس کے سفر سے جڑی کہانیوں بس میں ہونے والے کالج فیلوز کے عشق اور بسوں کے مخصوص ڈرائیور چاچاؤں کے نام یاد کرنے کی کوشش کرتے رہے

تمھیں مری سالگرہ کا دن یاد ہے --- اس نے میری جانب ایک دم سے پلٹتے ہوئے بے یقینی سے پوچھا---

سالگرہ کا دن---- شادی کا دن---- امریکہ روانگی کا دن--- میں نے فر فر سارے دن بولے--- تو اس نے او مائی گاڈ کہہ کر اپنے دونوں ہاتھ اپنے سر پر رکھ دیئے۔

مجھے کلاس کی برتھ ڈے بک کہا جاتا تھا--- میں ایک بار پھر گویا ہوا--- ڈھیرے ڈھیرے بچھڑ جانے والے اس برتھ ڈے بک کو موت کا انسائیکلوپیڈیا بناتے جا رہے ہیں--- ہم دونوں دیر تک بچھڑ جانے والے کلاس فیلوز کو یاد کرتے رہے---

اس پرانے کیمپس کی کینٹین اب بھی وہیں

ہے؟---اس نے شائد موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا---

ہاں --میں نے اس کی جانب دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا---

کینٹین کے مرکزی دروازے تک پہنچنے والی وہی سات سیڑھیاں وہی ماربل کی ریلنگ اور وہی تیسری سیڑھی کے ساتھ کی ریلنگ کا ٹوٹا ہوا ماربل---

تمھیں اب تک یاد ہے وہ چونکتے ہوئے بولی---اور ریلنگ کا وہ ماربل اب تک تبدیل ہی نہیں ہوا---اس نے حیرانگی سے پوچھا

یاد ہے جب ایک بار اسی ٹوٹے ہوئے ماربل سے تم نے ہاتھ زخمی کر لیا تھا تو کتنی مشکل سے خون رکا تھا---میں اس کی بات سنی ان سنی کرتے ہوئے بولا---

کینٹین کے دو ہال بن گئے ہیں ---میں اس کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بولا --لیکن مجھے تو وہی لوہے کی کرسیوں اور میز والا ہال یاد آتا ہے جہاں سے بند انڈہ، بند سموسہ اور کولڈ ڈرنک ملا کرتا تھا

گزرے دنوں کو یاد کر کے اس کی پلکوں کے کنارے پر ایک بار پھر تیرگی سی تیرنے لگی --سورج اب فٹ بال گراؤنڈ کے اوپر سے سفر کرتا ہوا پرانے موتی محل کے پار چھپنے کی کوشش کرنے لگ گیا تھا---

تمھیں یاد ہے جب اوجھڑی کیمپ کے حادثے میں ایک میزائل اسی گراؤنڈ میں گرا تھا تو ہم اسی دیوار پر بیٹھے ہسپتال جانے والی بس کا انتظار کر رہے تھے---

اور تم اب میزائل گرنے کے بعد میرے رونے کا مذاق اڑانے کی کوشش کرنے لگے ہو؟ ---وہ مسکرا کر میری جانب ہاتھ لہراتے ہوئے بولی

میں تو یہ کہنے لگا تھا کہ تم روتی ہوئی بہت پیاری لگتی ہو-----

شائد اسی لیے زندگی بھر ---وہ کہتے کہتے رک گئی اور ہتھیلی سے پلکوں کے کنارے سے چھلکتے آنسوؤں کو خشک کرنے لگ گئی

فزیالوجی (physiology) کا لیکچر تھیٹر اسی اولڈ کیمپس میں ہے کیا؟---اس بار اس نے موضوع تبدیل کیا

ڈائسکشن ہال (dissection hall) اور فزیالوجی کے لیکچر ہالز اب بھی یہیں ہیں لیکن ان کے درمیان سیڑھیاں شروع ہونے سے پہلے دیوار پر مزین وال میگزین (wall magazine) اب نظر نہیں آتا۔ لیکچر ہالز سے نیچے آئیں تو اس زمانے کی مرکزی راہداری اب بند کر دی گئی ہے۔ وہ سیڑھیاں جہاں پورا دن بعد بیٹھ کر میں تمھارا انتظار کرتا تھا اب مرکزی دروازہ مستقل بند ہونے کی وجہ سے ویران ہو گئی ہیں۔ نئے آنے والے یہ جان ہی نہیں سکتے

کہ ان سیڑھیوں پر کتنے ہی پروانے دروازے سے ظہور پزیر ہوتے ہوئے چراغوں کی لو میں بھسم ہو گئے---

تم تو نہیں ہو سکے ---اس نے میرے افسانوی انداز بیاں کو درمیان میں روکا تو میں کوئی جواب نہ دے سکا

ہوسٹل میں اپنے کمرے میں گئے ہو- کچھ دیر خاموش رہنے کے ایک بار پھر بولی

ہاں آج سب کلاس فیلوز کے اکٹھا ہونے سے پہلے اپنے کمرے میں گیا تھا--- میں اسے صبح کی روداد بتانے کی کوشش کرنے لگا --

تمھیں شائد پتہ ہی نہ ہو کہ ہوسٹل نمبر دو کے کمرے سے تمھیں دیکھنے کے لیے کتنے ہی سال میں نے اپنا کمرہ نمبر نہیں بدلا-----

برسوں بعد آج صبح جب اس کمرے کی بالکونی سے میں نے تمھیں اسی مخصوص جگہ دیکھنے کی کوشش کی تو میرے رستے میں باہر کا ایک درخت آ گیا جی تو چاہا کہ اس درخت کو کاٹ چھانٹ کے منظر کو واضح کرنے کی کوشش کروں لیکن پھر دھندلائی ہوئی آنکھوں کے سامنے اڑی ہوئی عینک کو درست کرتے ہوئے میں لوٹ آیا۔

میری بات سن کر اس نے ہوسٹل کی جانب دیکھا اور آنکھوں میں جگمگاتے جگنوؤں کو مجھ سے چھپانے کی کوشش کرنے لگی -- شام کے سائے اب سارے منظر پر حاوی ہونے لگے تھے ہوسٹل کی اکا دکا روشنی ٹمٹمانے لگی تھی اور سورج جو دوپہر سے ہمارا ساتھ دینے کی کوشش کر رہا تھا کہیں دور جا کر چھپ گیا تھا---

مجھے اب جانا ہوگا ---وہ گیٹ کے قریب سیکورٹی گارڈ کے پاس بیٹھے اپنے ڈرائیور کو بلاتے ہوئے بولی

بس--- میں کچھ نہ سمجھتے ہوئے بولا

تمھیں اب بھی میری محبت ڈھونگ لگتی ہے ---- میں اسے روک نہ سکنے کا یقین رکھتے ہوئے منمنایا

اب ان باتوں کا فائدہ ----وہ تلخی سے سرگوشی کے انداز میں بولی ------ عشق پوچھتا نہیں ---- عشق سکھایا نہیں جاتا --- عشق محتاج نہیں ہوتا---

میں نے اس کی کسی بھی بات کو نہ سمجھنے کے باوجود اثبات میں سر ہلا دیا--

عاشق کو اس کا جذب نچاتا ہے اور گھوڑے کو ڈھول کی تھاپ ---- --- گھوڑا مالک کی رضا کا محتاج ہوتا ہے اور عشق ان سب جھنجھٹوں سے بے نیاز ------اس نے گاڑی جانب بڑھتے ہوئے ہتھیلی کی پشت سے اپنی آنکھوں کو صاف کرنے کی کوشش کی اور میری جانب دیکھے بغیر گاڑی کی جانب بڑھ گئی -----

☆☆☆☆☆

کوئی بکری لے آئے

گل بخشالوی

روشنہ خیمے میں اپنے تین سالہ بیٹے گل زادہ کیساتھ چٹائی پر بیٹھی تھی۔ سامنے مٹی کے تیل کے چولہے پر دیگچے میں پانی اُبل رہا تھا لنگر والے ابھی لنگر لے کر نہیں آئے تھے اور گل زادہ کو بھوک لگی تھی روشنہ اپنے معصوم بیٹے سے جھوٹ بول رہی تھی ''بیٹا بس تھوڑی دیر اور صبر کرو وہ دیکھو چاول پک رہے ہیں'' معصوم گل زادہ ماں کے کہے پر دیگچے سے اُٹھتی ہوئی بھاپ دیکھتے ہوئے سوال پر سوال کر رہا تھا بے بے داجی کہاں ہیں؟

وہ ماں سے جواب سننے کے لیے ماں کے افسردہ چہرے پر نظریں جمائے بیٹھا تھا، ماں اسے کیا جواب دیتی، اُسے کیسے سمجھاتی کہ تمہارا داجی گاؤں میں لڑکیوں کے سکول کا چوکیدار تھا نفاذِ شریعت کے علمبرداروں نے سکول کو دھماکے سے اُڑا دیا تھا جس میں گل زادہ کے داجی، دیواروں کے پتھروں کیساتھ ریزہ ریزہ ہو کر وادی میں بکھر گیا تھا۔ کوئی جواب نہ پا کر گل زادہ نے پوچھا ''بے بے ہم تانبو (خیمے) میں کیوں ہیں آؤ گھر چلیں، دادی ماں دادا ابو انتظار کر رہے ہوں گے کاکا جی (چچا) بھی تو سکول سے آیا ہوگا میرے لیے ٹافیاں لے کر وہ تو میرے بغیر کھانا بھی نہیں کھائے گا میری

بکری کا بچہ اور ڈبو (کتا) بھی میرے لیے پریشان ہوں گے وہ بھی تو میری طرح بھوکے ہوں گے"۔

روشنہ خاموش تھی اُس کے پاس گل زادہ کے کسی سوال کا جواب نہیں تھا کچھ تھا تو اُس کی آنکھوں سے گلاب گالوں پر بہتے ہوئے وہ آنسو، جو غم زدہ دل کے چشمے سے آنکھوں کے کمزور پشتوں کو توڑتے ہوئے اُس کے زانو پہ سر رکھے گل زادہ کے بے لباس جسم پر گر رہے تھے۔ روشنہ کی عمر ہی کیا تھی یہی کوئی ۱۸ سال، جوانی میں بیوہ ہوگئی تھی شوہر سکول کی چوکیداری کے دوران شہید ہوگیا سسر گاؤں کی مسجد میں نمازِ عشاء کے دوران دھماکے میں چل بسا، ساس اپنے شوہر اور بیٹے کا غم برداشت نہ کر سکی وہ اللہ کو پیاری ہوگئی جس کے جنازے میں کسی اسلام پسند نے کئی ایک دوسرے مسلمانوں کو اپنے ساتھ بم دھماکے میں اُڑا دیا جن میں اُس کا دیور مکرم خان بھی شامل تھا۔ گاؤں کے لوگوں کی متضاد باتوں میں وہ سوچتی رہتی کہ سچائی کیا ہے کون ظالم ہے، کون مظلوم لیکن ایک دن پڑوس میں ٹیلی ویژن پر ایک عورت کو سرِ عام کوڑے کھاتے دیکھ کر طالبان سے نفرت ہوگئی تھی اُس نے اپنی قوم میں ایسا ظلم نہ تو پہلے دیکھا تھا نہ سنا تھا لیکن کیا کرتی اس وقت تو وہ خود مظلوم تھی اپنے تین سالہ بیٹے کیساتھ زندگی کا بوجھ اُٹھائے گاؤں میں اپنے ڈور ڈنگر کی رکھوالی میں جی رہی تھی کہ پاک فوج نے کرفیو لگا کر گاؤں خالی کرنے کا حکم دیا اور وہ دوسرے کئی گاؤں والوں کیساتھ گھر سے بے گھر ہو کر خیمہ بستی میں آباد ہوگئی تھی۔ روشنہ انہی خیالوں میں گم پریشان تھی کہ گل زادہ نے اُسے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ماں مجھے بھوک لگی ہے بکری کے دودھ میں چوری بنا کر دو۔

روشنہ بے قابو ہوگئی اُس نے تڑاخ سے گل زادہ کے معصوم گلاب گال پر تھپڑ مارتے ہوئے کہا (خدائے دے واخلہ 3/4 زہ پہ شیم او تہ مزے غواڑے) کم بخت میں کس پریشانی میں ہوں اور تم مزے مانگ رہے ہو، گل زادہ کو ماں کے ایسے ردِ عمل کی توقع نہیں تھی وہ سہم گیا ایسا جیسے اسے سانپ سونگھ گیا ہو اُس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے معصوم گال پر ماں کی پانچ اُنگلیوں کے نشان پر چمکنے لگے۔ روشنہ نے اُچھک کر گل زادہ کو سینے سے لگا لیا وہ رونے لگی بچے کے گلابی گال کو اپنے ہونٹوں کی تپش سے سہلانے لگی تھی کہ خیمے سے باہر خیمہ بستی کے مکینوں کے دوڑنے کی آواز آئی وہ سمجھ گئی لنگر دینے والے آگئے، اُس نے گل زادہ کو چٹائی پر بٹھا دیا اور دیگچہ لے کر دوسروں کیساتھ لنگر لینے دوڑتے ہوئے ٹرک کے قریب آئی ہر کوئی دوسرے سے پہلے کھانے لینے کے لیے بے چین تھا وہ جانتے تھے کہ

کھانا عموماً کم پڑ جاتا ہے اور قطار میں کھڑے لوگ صرف انتظار ہی لے کر واپس خیمے میں چلے آتے ہیں۔

لنگر لے کر آنے والے غضبناک لہجے میں بول رہے تھے قطار میں کھڑے ہو جاؤ ورنہ کھانا نہیں ملے گا اور خیمہ بستی کے لوگ قطار میں دور تک کھڑے ہو گئے کھانا تقسیم کرنیوالے اپنے ساتھ اخبار والے بھی لے کر آئے تھے جو خیمہ بستی کے فقیروں کی تصویریں لے کر اخبار کا پیٹ بھرنے کے لیے خبریں بنا رہے تھے۔ روشنہ کی باری میں کافی وقت لگ گیا اپنی باری پر لنگر لینے کے لیے اُس نے دیگچہ آگے بڑھایا فوٹو گرافر خوبصورت روشنہ کی تصویر بنا ہی رہا تھا کہ زرینہ دوڑتی شور مچاتے پکارتے آ رہی تھی (روشنے خدائے والے حوے دے اوسنریدو) کم بخت روشنے تمہارا بیٹا جل گیا ہے روشنہ نے دیگچہ زمین پر پٹخ دیا دوڑتی ہوئی خیمے کی میں آئی، گل زادہ ایک خاتون کی گود میں جلن سے تڑپ رہا تھا ماں کو دیکھتے ہی سہم گیا اُسے کچھ دیر پہلے والا تھپڑ یاد تھا روشنہ نے بچے کو اُٹھا کر گلے سے لگایا اور چیخ چیخ کر پکارنے لگی "کوئی بکری لے آئے" میرے بیٹے کو دھاروں کی ضرورت ہے گاؤں میں عام طور پر ایسے جلے جسم پر بکری کے دودھ کی تازہ دھاروں کے ساتھ نمک لگا دیا جاتا ہے تو جلے ہوئے وجود پر پھوڑے نہیں نکلتے اور وقتی طور پر سکون بھی آ جاتا ہے۔ گل زادہ ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا ماں کے خیمے سے باہر جانے کے بعد اُسے بھوک نے ستایا تو اُبلتے ہوئے پانی کے دیگچے میں چاول دیکھنے کے لیے جیسے ہی اُس نے دیگچے کے ڈھکنے کو ہاتھ لگایا تو اُنگلیاں جلنے سے تڑپ اُٹھا جھٹکے سے دیگچہ میں اُبلتا پانی اُس پر آ گرا تھا جس سے اُس کا جسم جل گیا۔

خیمہ بستی میں ڈاکٹر کا انتظام نہ ہونے کی وجہ سے موقع پر موجود صحافیوں نے کمالِ ذمہ داری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہنگامی بنیاد پر قریبی شہر میں پاک آرمی سے رابطہ کیا اور ایمبولینس منگوائی لیکن شدت پسندوں کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کے لیے حکومت کے خلاف مذہبی جماعتوں کے جلوس کی وجہ سے ٹریفک جام تھی ایمبولینس کو راستہ نہیں ملا اور گل زادہ اپنی بھوک اور جلے ہوئے جسم کے درد کو برداشت نہ کر سکا ماں کی گود میں ایک کمزور سی ہچکی لی اور اُس کی روح پرواز کر گئی موقع پر موجود خواتین اور بچے زار و قطار رونے لگے روشنہ آسمان کی طرف دیکھنے لگی جیسے گل زادہ کی پرواز کرتی ہوئی روح سے کہہ رہی ہو۔

"بیٹا تم بھی چلے گئے میں تو تمہارے لیے جی رہی تھی اب تمہارے بغیر میں تنہا جی کر کیا کروں گی؟" روشنہ گل زادہ کی لاش کے ساتھ چٹائی پر بسم اللہ پڑھتے ہوئے بے جان ہو کر ہمیشہ کے لیے سو گئی"

☆☆☆☆☆

حادثہ

نجم رضوی

ہر شخص کی قیمت وہ ہنر ہے جو اُس شخص میں ہوتا ہے - یہی تو وجہ تھی کہ رحیل سر پروفیسر اختر صاحب کا دیوانہ تھا- ہوتا بھی کیسے نہ لاہور میں انگلش لٹریچر کے آسمان ادب کے درخشندہ ستارے، ماڈرن ادب پر گہری نگاہ رکھنے والے ---- جن کا طوطی سارے لاہور میں بولتا تھا، وہ سب کے سب تو اُن کے شاگرد تھے-

پرنسپل شپ سے ریٹائر ہونے کے بعد، پڑھانے کا چسکا ایسا چسکا ہوتا ہے کہ انسان کی جان نہیں چھوڑتا، قریبی لڑکوں کے اصرار پر، سر نے ایم- اے انگلش لٹریچر کی کلاس اپنے گھر میں شروع کر دی- گھر کے مین گیٹ کے ساتھ، رنگ برنگے پھولوں کی بیلوں میں سے بل کھاتا، لوہے کی سیڑھیوں سے راستہ، مستطیل نما کمرہ میں جاتا- یہی کمرہ لڑکوں کے لئے ایک سکول آف تھاٹ تھا- کلاس کے آغاز کے لئے سر نے کبھی کوئی اشتہار یا کلاس کے باہر کوئی بورڈ نہیں لگوایا تھا- سارا سال لڑکے آتے رہتے تھے اور کلاس بنتی رہتی تھی - اس کلاس میں مختلف کالجوں کے سٹوڈنٹ آتے - اس کلاس سے، ان ریگولر سٹوڈنٹس کا فائدہ تو ہوتا ہی تھا لیکن اُن کے

ساتھ ساتھ تعلیمی لحاظ سے پس ماندہ، حالات کے ستائے ہوئے، پرائیویٹ طالب علم بھی بہت زیادہ مستفید ہوتے۔ سراختر کا کمال تھا کہ انگلش لٹریچر پر مضبوط گرپ ہونے کے ساتھ ساتھ، بچوں کو پاس کروانے کا فن بھی جانتے تھے۔ ان پرائیویٹ طالب علموں کی وجہ سے وہ اس کلاس کو بہت اہمیت دیتے تھے۔ وہ خود بھی کہا کرتے تھے،

This class is my life-blood..... life-plug.

ایک دفعہ انھوں نے ایک سکول کے فنکشن کی صدارت کرتے ہوئے، اپنے پروفیشن، اپنی prior ty کے بارے میں بڑی وضاحت سے خود کہا تھا at all, that is the My classroom. domain, if any, لیکچرار سے پرنسپل بننے تک کا سفر انھوں نے نہایت patience اور محنت سے طے کیا تھا، استاد کی یہ ایک بہت بڑی خوبی ہوا کرتی ہے۔ حقیقت میں، اپنی روح کی گہرائی تک وہ صرف اور صرف ایک استاد ہی تھے۔ کالج میں بھی انھوں نے محض خانہ پری کیلئے اس پروفیشن کو جوائن نہیں کیا تھا۔ وہ کالج میں دہاڑی لگانے نہیں آتے تھے ـــــ کالج آئے --- حاضری لگائی --- کلاس میں گئے، کتاب کھولی ---- موبائیل پر فون آ گیا--- آدھا گھنٹہ پار ------- واپس آئے۔ کہا، اس سبق میں تو مجھے کوئی خاص بات نظر نہیں آتی -------- کل خلاصے سے فلاں فلاں سوال یاد کر لینا ـــــ بچوں کا خانہ خراب ----- آپ کے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کا بچوں کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ ٹائم دیکھتے رہے، ٹائم ختم ـــ وہ آئے --اور وہ گئے۔ پاکستانی ایجوکیشنل سسٹم کو ان دہاڑی دار استادوں نے تباہ کر کے رکھ دیا ہے۔ ان کی سلیکشن میں بھی ان کی قابلیت نہیں ـــ ان کی ڈگریاں دیکھ کر کی جاتی ہے۔ اور اُن میں پڑھانے کا جذبہ چیک کرنے والا کوئی پیمانہ نہ تھا ـــ لیکن سر کا کیا تھا، کلاس شروع ہوتی --- سبق میں غرق ہو جاتے۔ ان کے پاس جو علم تھا اس کو سٹوڈنٹ تک مکمل دیانت داری کے ساتھ پہنچانے کی کوشش کرتے۔ اپنے علم کا رعب نہ جماتے بلکہ ان کو، ان کے لیول تک اتر کر علم سے سیراب کرنے کی کوشش کرتے۔ یہی وطیرہ --- یہی عادت اپنی اسی کلاس میں بھی رہی۔ وہ پڑھاتے نہیں تھکتے تھے۔ پڑھاتے ہوئے خود بھی لطف لیتے تھے۔

عظیم استاد تو وہ تھے ہی لیکن انسان بھی بہت بڑے تھے۔اس وقت جب وہ ایران سکالر بن کر، انٹرنیشنل پرشین کانفرنس میں، شاہنامہ فردوسی---ایک عظیم ایپک عالمی تناظر میں، پر اپنا مقالہ پڑھنے گئے تھے۔ جب وہاں ایک بہت بڑی لائبریری میں دوسروں مدعوین کے ساتھ گئے تھے۔ مختلف کتابوں کو دیکھتے ہوئے انھوں نے ایک کتاب دیکھی - اس کو ریک سے نکال کر آنکھوں سے لگایا اور اُس کو چوما، دوبارہ اس کو اُسی ریک میں رکھ دیا - دوسروں ساتھیوں میں سے ایک ساتھی بھی اس ریک کے قریب پہنچا، ریک سے وہی کتاب نکال کر اُس کو غور سے دیکھا۔ حیران ہوا، سر کے پاس گیا، کہ شاید غلط فہمی کی وجہ سے کسی اور کتاب کو قرآن سمجھ کر آنکھوں پر لگایا اور چوم آئے ہیں - سر کی توجہ اس امر کی طرف مبذول کرائی، کہ انھوں نے بھی اُس کتاب کو غور سے دیکھا، وہ قرآن نہیں بلکہ اقبال لاہوری کی کتاب ہے۔ سر نے بڑے دھیمے لہجہ میں جواب دیا---''ہاں میں جانتا ہوں--- اگرچہ یہاں تو میں ایک سکالر بن کر آیا ہوں --- لیکن بنیادی طور پر میں ایک بک بائینڈر کا بیٹا ہوں --- میں نے کتاب دیکھی اس کا من دیکھا، اُس سال بک بائینڈنگ کا ٹھیکہ میرے والد صاحب کے پاس تھا۔ اس کتاب کو میرے والد کے ہاتھ لگے ہوئے ہیں---اس لئے میں نے اس کتاب کو چوما بھی اور آنکھوں پر بھی لگایا۔ ان کی آنکھیں چھلک پڑیں۔ ان کے ساتھیوں کو جیسے سکتہ ہو گیا۔

جب رحیل نے سر کے کالج میں ابھی ایم۔اے کی تعارفی کلاس جوائن کی، سر کے پہلے ہی فقرے نے اُس کی ساری توجہ اپنی جانب مبذول کروالی تھی۔ جب انھوں نے دھیرے سے کہا، لٹریچر حیران ہونے اور حیران کرنے کا نام ہے۔ انھوں نے پہلے ہی دن کہا تھا، اگر آپ ادب کے ان کرداروں کے ساتھ ہنس اور رو سکتے ہیں تو لٹریچر رکھیں ورنہ چھوڑ دیں۔ ان سے ادب پڑھنے کا سواد اُس کے منہ سے پھر ساری زندگی نہ جا سکا۔ شیکسپیئر کا پلے، ہملٹ شروع ہوا، پھر کیا تھا،

To be or not to be,That is the question یہ لائنیں شروع ہو ہیں، ہفتہ دو ہفتہ ان لائنوں ہی کو کھنگالتے گزر گئے۔

Robert Browning شروع ہوا، Browning's Dramatic Monologue عنوان کو چھوٹے چار حصوں میں تقسیم کیا

جاتا - براؤنگ --- ڈرامیٹک ----
مونو ---لاگ اور لیکچر شروع ہو جاتا-
پڑھاتے نہ مرشد کو ہوش نہ سنتے مریدین کو-
ڈرامہ ہو کہ ماڈرن یا کلاسک شاعری، نثر ہو
کہ ناول، جو انھوں نے پچیس سال تک
کالج میں پڑھایا تھا اور اس پیپر کے
ایگزامین رہے تھے، کسی بھی لائن کو لیا جاتا،
لفظوں کو disect کیا جاتا، اس کے ہر
شیڈ کو ڈسکس کیا جاتا---- لفظوں کے
مختلف معنی دیکھے جاتے، تھیم سمجھایا جاتا، ہر
سٹوڈنٹ کو اس بحث میں involve کیا
جاتا- ایک بات کہی جاتی اور دوسری ان کہی
بات سمجھی جاتی- مثلاً وہ کہتے، وہ بہادر ہے،
یہ بات کہی جاتی اور وہ بزدل نہیں ہے، سمجھی
جاتی- اَن کہی باتوں اور مطالب کو سمجھنے کی
سعی کی تربیت، اس کلاس میں دی جاتی-
جس کو کہتے ہیں نا بال کی کھال اُتارنا، وہی
عمل اس کلاس میں ہوتا-

سر ایک صاحب رائے انسان تھے- اُن کے
ایک ایک لفظ کا، ایک ایک فقرہ کا وزن ہوتا-
وہ سمجھاتے جاتے، یہ دنیا واقعات کا ایک
سمندر ہے - واقعات کی اس انارکی میں
غیر ضروری واقعات کو حذف کر کے خوبصورت
واقعات کو بہترین ترتیب دینے کا نام ادب
ہے- یہ ایک ادیب ہی کا کمال ہوتا ہے کہ وہ
ایک خاص وقت---یا لمحات کے جذبات کی
شدت کو صفحہ قرطاس پر منجمد کر دیتا ہے، مردہ
لمحات ہمیشہ کے لئے زندہ و جاوید ہو جاتے
ہیں حالانکہ انسان فطرتی طور پر اپنی پوری
زندگی، کسی معاملہ میں ایک جیسے جذبات نہیں
رکھتا- اُس کی رائے اور سوچ بدلتی رہتی ہے-
کسی کو ساری عمر ایک ہی intensity کے
ساتھ نہیں چاہا جا سکتا- وہ تشریح کرنے لگتے،
ادب کا کام انسان کو اپنے آپ کی سمجھ دینا ہے
تا کہ وہ دوسروں کے جذبات سمجھ سکے اور ان
سے ہمدردی کر سکے- وہ کہتے کہ ادب اگرچہ
ایک شعوری کوشش کا نام ہے لیکن اس میں
لاشعور کی ایک بہت بڑی کنٹری بیوشن ہوتی
ہے- وہ حسن کو صداقت کے مترادف سمجھتے اور
حسن کو فوری مسرت کا ذریعہ جانتے- یہیں
سے کیٹس اور ورڈورتھ تک پہنچ جاتے-

A thing of beauty is joy forever.

Truth is beauty,beauty truth,that is all.

وہ وضاحت کرتے، یورپ نے خوبصورتی
کا تصور ہی بدل کر ہی رکھ دیا ہے- کبھی
انسان کے اندر کی روحانی خوبصورتی کو اصل
خوبصورتی سمجھا جاتا تھا- خوبصورتی اور
روحانیت کا سمبل لائیٹ کی صورت میں یا

کسی فرشتہ کی شکل میں پیش کیا جاتا۔ یورپ میں جیسے جیسے مادیت بڑھتی گئی ویسے ویسے اندرونی روحانیت ختم ہوتی گئی۔ یورپ نے آہستہ آہستہ اپنا سارا فوکس ظاہری خوبصورتی پر کر لیا ۔۔۔۔۔۔۔ جسمانی خوبصورتی کو گلوری فائی کیا جانے لگا۔ human body میں خوبصورتی تلاش کی جانے لگی۔ انبیاء کرام کی تصویریں برہنہ پیش کی جانے لگیں، ان میں خوبصورتی تلاش کی جانی لگی۔ وہ موسیقی کو کانوں کی اور مصوری کو آنکھوں کی شاعری بتاتے۔ وہ اصرار کرتے کہ وزن کے بغیر بھی عظیم شاعری ممکن ہو سکتی ہے۔ وہ کہتے کہ نثر میں الفاظ بہترین ترتیب میں اور شاعری میں بہترین الفاظ بہترین ترتیب میں پیش کیے جاتے ہیں۔

وہ ڈرامہ کو An actment of a story on the stage اور کشمکش کو Confict is the essence of the drama. بتاتے۔ شارٹ سٹوری اور ناول کی کیا خوبصورت تعریفیں کیا کرتے۔ ان دونوں کے فرق کو بڑے احسن طریقے سے سمجھاتے۔ وہ کہتے، اگر اندھیرے کمرہ میں جایا جائے، ٹارچ روشن کی جائے، صرف ایک چیز پر روشنی ڈالی جائے، صرف اسی کو بیان کیا جائے تو یہ کہانی ہو گی۔ اگر روشنی ٹریول کرتی، کمرے کی آپس میں مربوط مختلف چیزوں کو واضح کرتی جائے تو یہ ناول ہے ۔۔۔۔ اگر زندگی کے کسی ایک پہلو کو ڈسکس کیا جائے تو وہ شارٹ سٹوری ہے اگر زندگی کے مختلف پہلوؤں کی عکاسی کی جائے تو یہ ناول ہو گا۔ وہ انگلش کہانی، اردو کہانی اور پنجابی کہانی نہیں پر یقین نہیں رکھتے تھے ۔۔۔۔ وہ کہتے کہانی تو کہانی ہے۔۔ زبانیں تو میڈیم ہیں جس میں کہانی یا ادب تخلیق ہو رہا ہے۔ وہ کہتے، اکثر سٹوڈنٹ کے لیے پلاٹ اور کہانی کے فرق کی وضاحت نہیں ہو پاتی۔ وہ مثال دیتے، ایک بادشاہ تھا اور ایک ملکہ تھی۔ بادشاہ مر گیا اور ملکہ بھی مر گئی، یہ کہانی ہے۔ بادشاہ مر گیا اور اس کے غم میں ملکہ بھی مر گئی، یہ پلاٹ ہے۔۔ بس یہ cause and effect کی جو chain بنتی ہے۔ اسی کو پلاٹ کہتے ہیں۔ واقعات میں جب منطقی ربط نہیں بن رہا ہوتا ۔۔۔۔۔ یہی عنصر بہت اہم ہے ۔۔۔۔ ہماری فلموں اور ڈراموں میں واقعات میں منطقی ربط نہیں بن پاتا ۔۔۔ پلاٹ کمزور ہو جاتا ہے۔ piece of writing اپنا اثر کھو

دیتی ہے۔اثر کے لئے حقیقت کی عکاسی کی بہت ضرورت ہے ۔ حقیقت بذات خود خوبصورت ----- گلیمرس ہے ۔سر فرماتے ،ضروری نہیں بہت پڑھا لکھا ہو تو وہ ہی بہت اچھا استاد ہو سکتا ہے ------ بلکہ حقیقت میں اچھا استاد وہ ہوتا ہے جو سٹوڈنٹ کو ان کا سبق آسان سے آسان طریقے سے سمجھا اور پیش کر سکے۔استاد کا کام میٹریل کو خوبصورت اور سمجھانے کے لیے آسان بنا کر پیش کرنا ہے۔ سر بڑے دکھ سے کہتے ،نئی نسل sense of direction کھو چکی ہے۔استاد کا کام سٹوڈنٹ میں چھپی صلاحیتوں کا کھوج لگا کر ڈھونڈنا اور ان کو point out کرنا ہے۔ ان میں موجود skills کو پالش کرنا بھی استاد کا ہی کام ہے۔ سبق میں read between the lines کا سمجھانا استاد کے فرائض میں شامل ہے۔ استاد کا کام سبق کے متعلقہ علم اور واقعات کو relate کرنا، انہیں زیادہ سے زیادہ علم مہیا کرنا ہے تا کہ ان کو زندگی گزارنے اور سمجھنے میں مدد ملے کیونکہ کلاس اور کلاس کے کام نے تو آخر ایک دن ختم ہو جانا ہوتا ہے۔ اس کے بعد عملی زندگی کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا بیکراں سمندر ان کا منتظر ہوتا ہے ۔ وہ کہتے ، ٹیچنگ اور لکھنے میں ایک بات کامن ہے۔استاد اور لکھنے والے کی شخصیات بہت اہم ہوتی ہیں ۔ان کی شخصیات جتنی چارمنگ ہو گی اتنا ہی ان کا سبق اور رائٹنگ بھی دلچسپ ہو گی۔ وہ کہتے ،خدا نے اپنے بندوں کو بہت سی خوبیوں سے نوازا ہوا ہے۔اللہ تعالی کسی سے کوئی خوبی اگر واپس لیتا ہے تو اس کو اس کے بدلے ڈھیر خوبیاں عطا بھی فرما دیتا ہے۔یہ بندے کا کام ہے کہ اپنی خوبی کو پہچانے ----اپنا مقصد پہچانے ----اور مقصد ہمیشہ مشکل ہوتا ہے-- جتنا بڑا مقصد ہو گا اتنا بڑا چیلنج ہو گا اسے حاصل کرنے کے لئے اسے اتنی زیادہ محنت کرنی پڑے گی۔ سر کیا خوبصورتی سے وضاحت کرتے ،ہم جو کہانیاں، ناول پڑھتے ہیں یا ڈرامہ دیکھتے ہیں، ہمارے اندر بھی ان کرداروں کے ساتھ ایک دنیا بنتی بگڑتی رہتی ہے ۔ہم دیکھتے ہیں مخصوص حالات میں کردار کیا کرتے ہیں اور کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔اس طرح ایک خاص کردار اسی ماحول میں مختلف react کرے گا۔اس سے ہماری انڈرسٹینڈنگ پروان چڑھنے لگتی ہے، ہمارا ادراک ڈویلپ ہونے لگتا ہے۔---اور اسی کو بصیرت کہتے ہیں۔ انسان، انسان ہی کی طرح

complicated ہوتا ہے اس لئے کسی کے بارے، سر Sweeping Judgement نہیں دیتے تھے۔ سر کے ساتھ گزارے ------ یا شاید اُن کی جوتیاں میں بیٹھے اور انہیں سیدھیاں کرتے دو سال اگر رحیل کی زندگی سے نکال لئے جاتے تو شاید باقی کچھ نہ بچتا۔

سر کے نزدیک، استاد کا ایک کام بچوں کو دین اور دنیا کی فلاح کی طرف بلانا بھی ہے۔ وہ تخلیقی ادب پاروں کا قرآن اور اسلام سے تعلق جوڑنے کی ہر ممکن کوشش کرتے۔ سر کا قرآن اور اسلام کا نالج بھی حیرانگی کی حد تک تھا۔ وہ کہتے، قرآن تاریخ کی کتاب نہیں ہے کہ واقعات اور سن بتاتا پھرے اس کا اصل زور ان واقعات کے نتائج اور ان کے اخلاقی سبق پر ہے۔ اگرچہ سر کو عربی زبان نہیں آتی تھی لیکن ان کو تقریباً قرآن کے تمام قصے ازبر تھے۔ دو سالہ کلاس میں وہ ان واقعات کو مختلف طریقے سے دوران لیکچر بیان کرتے رہتے تھے۔ سر کی خوشامد نہیں، حقیقت ہے، ویسے اسلام اگر کسی کی خوشامد کی اجازت ہے تو وہ صرف استاد کی ہے، وہ اچھی بھلی سورہ فاطر، سورہ کہف اور سورہ حمد کی تشریح کر لیا کرتے تھے۔ وہ بتاتے، دانتے کی Devine Comedy کے سارے کے سارے واقعات محسن انسانیت، مرسل اعظم، منبع ھدایت، نبی آخرالزمان کے معراج شریف کے واقعات سے اخذ شدہ ہیں۔ سر اس بات پر بھی بہت زور دیتے تھے کہ Milton نے Paradize Lost لکھتے ہوئے یقیناً بار بار قرآن پاک کا مطالعہ کیا ہو گا۔

پھر کیا تھا، سر نے (Prose) کا پیپر پڑھانا شروع کی۔ آف پیرنٹس اینڈ چلڈرن (Parents and Of Chlidren) مضمون پڑھانا شروع کیا۔ اب کیا تھا والدین — ماں — باپ - - - بچے، ایک ٹرائی اینگل (ٹرائی اینگل) شروع ہوگئی۔ تمہید میں، والدین کے حقوق شروع ہوگئے۔ ماں کا ٹاپک شروع ہوگیا ------ انگلش، اردو اور پنجابی ادب حوالوں سے بھر دیا گیا۔ میکسم گورکی کی بات One can talk endlessly about mother سچ دکھائی دینے لگتی۔ انور مسعود کی اٹھائیس لائنوں کی نظم نے پانسہ ہی بدل دیا۔ دل کرنے لگتا کہ گھر جا کر ماں کے قدم چومے اور اس سے لاڈ کرے۔

آف پیرنٹس اینڈ چلڈرن، سر کا فوکس ماں پر ہی

رہا۔ وہ واقعہ تو سب کو ہلا کر رکھ گیا۔ جب ایک آدمی اللہ کے ولی کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے بتایا کہ دنیا کا کوئی گناہ اس نے نہیں چھوڑا۔ وہ پوچھ رہا تھا کہ کیا اس کے گناہ معاف ہو سکتے ہیں۔ اس اللہ کے ولی نے صرف یہی پوچھا تھا کیا اس کی ماں زندہ ہے؟ نہیں! اس نے جواب دیا تھا۔ انھوں نے کہا، جاؤ اور اپنے والد کی خدمت کرو اور ان کا قرضہ ادا کرو۔ جب وہ شخص چلا گیا اور حویلی سے باہر نکل گیا تو انھوں نے اس کی پشت دیکھ کر حسرت سے کہا تھا، کاش اس کی ماں زندہ ہوتی!۔۔۔۔۔ اس کے گناہ فوراً معاف ہو جاتے! کلاس سے واپسی پر سراختر کے بتائے ہوئے ideas کے بارے، الفاظ کے اندر بند معانی کے سمندر کے بارے سوچتا رہتا۔ راستہ انھی سوچوں میں کٹ جاتا اور اس کا سٹاپ آجاتا۔ اس کو سفر کٹنے کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔

بچوں کی باتیں شروع ہوتیں تو ساری دنیا ان میں سمٹی ہوئی نظر آتی، ان کی معصوم عادات، حرکات، اور صفات مجسم شکل میں سامنے آ کھڑی ہوتیں۔ اور ان کے بغیر گھر قبرستان کا سماں پیدا کرتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اسے لگنے لگتا،

They are the natural comedian of the world's great stage. They do wrong things at wrong time. Jerome K. Jerome

باپ کی بات چھڑتی تو لمحات سکڑتے ہوئے محسوس ہوتے۔ رحیل کو یاد تھا صبح جب اس کا والد نماز کے لئے اٹھتا۔ اُس کو ایک دو آوازیں دیتے، اگر وہ گہری نیند سو یا رہا ہوتا ---- تو شفقت پدری سے مجبور ہو کر اس کے نہ اٹھنے -- کہ شاید پڑھتے پڑھتے سویا ہے۔ اگر اس کی قسمت اچھی ہوتی تو اس کی آنکھ کھل جاتی۔ وہ بھی باپ کی نماز کے لئے بچھی چٹائی کے پیچھے، چٹائی بچھا کر نماز پڑھتا۔ اور منہ اندھیرے چوری چوری اپنے باپ کا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتا۔ چہرہ پر نظر پڑھنے سے ان کی داڑھی کے سفید بال دیکھ کر اس کو لگتا کہ اس کا حج ہو گیا ہے اور اس نے ورجنت دیکھ لیا ہے۔

اُس دن بھی وہ کلاس سے جلدی نکل پڑا تھا۔ واپسی پر، دوست کے والد کی بیمار پُرسی کے لیے ہسپتال بھی جانا تھا۔ وہ ہسپتال کے لیے نکل پڑا۔ عجیب سی کیفیت اس پر چھائی ہوئی تھی۔ سراختر کے گھر سے کوئی ڈیڑھ کلو میٹر پیدل چل کر وہ بس سٹاپ پر پہنچا۔ بس پر سوار ہوا۔ رش کافی تھا۔ ایک سواری کے اترنے سے اس کو جگہ مل گئی اور وہ سیٹ پر

بیٹھ کر لیکچر کے متعلقہ نکات میں گم تھا۔

چوک میں بس رُکی اور پھر چلی۔ یکدم بس میں موجود کچھ سواریاں شور کرنے لگیں ،بس روکیں۔۔۔۔۔بس روکیں۔۔۔بس کے گیٹ سے بندہ لٹک رہا ہے۔۔۔۔۔ شور پھر اٹھا۔۔۔بندہ گر گیا۔۔۔بندہ گر گیا!! گاڑی روکو۔۔۔!! گاڑی رُکی ۔ سواریاں نیچے اتریں ۔شور مچ گیا، بندہ گاڑی کے نیچے آ گیا۔۔۔!! آناً فاناً بس خالی ہو گئی۔لوگ بس سے بیس، پچیس قدم پیچھے گرے ہوئے بندے کی طرف لپکے۔۔۔۔وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہجوم کے دائرہ سے نکل رہے تھے۔وہ تو پہلے ہی کمزور دل تھا۔۔۔۔بکھرا ہوا خون نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بڑی مشکل سے سیٹ سے اٹھا اور ہمت کر اس گرے ہوئے آدمی کو دیکھنے چل پڑا۔وہ سوچ رہا تھا۔۔۔پتہ نہیں اُس بندے کے گاڑی کی طرف لپکنے سے پہلے آٹومیٹک گیٹ بند ہو گیا تھا۔۔۔یا، مصنوعی روشنیوں میں اس کو شیشے کا گیٹ نظر نہیں آیا تھا۔۔۔یا۔۔۔ شاید بس میں سوار لوگوں کے شور سے گھبرا کر اس نے چھلانگ لگا دی تھی کہ پرے جا گرے۔۔۔ یا کہ اس بیچارے کا ہاتھ پھسل گیا تھا۔

وہ ہجوم کو چیر کر گرے ہوئے بندے کے قریب پہنچا۔ گاڑیوں کی تیز منعکس روشنی میں اس کا چہرہ قدرے صاف دکھائی دے رہا تھا۔پتہ نہیں کیا مقناطیسی طاقت ہوتی ہے، اس سڑک اور ٹائروں میں کہ جب بھی کوئی گرتا ہے یہ اس کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔وہ چوک سے ذرا آگے، سڑک کے بائیں کنارے گرا پڑا تھا۔وہ اُلٹا گرا پڑا تھا۔اس کی ٹانگیں شمال کی طرف اور سر جنوب کی طرف تھا۔بازو صلیب کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ گر کر اس کا رخ مغرب کی طرف ہو گیا تھا۔اُس کے کپڑے میلے میلے لگ رہے تھے۔۔۔ پاؤں میں پرانی ہوائی چپل تھی۔۔۔ پھیلے ہوئے بائیں بازو کی ہتھیلی میں لگے کسی زخم پر میلی سی پٹی لپٹی ہوئی تھی۔بس کا پچھلا چوڑا ٹائر اس کے سر پر سے گزر گیا تھا۔اُس کا سر بس کے وزن سے تھوڑا لمبوترا ہو گیا تھا۔حیرانگی والی بات تھی کہ اس کا سر بالکل صحیح سلامت تھا۔۔۔۔۔بس گاڑھا خون۔۔۔۔اُس کے کانوں سے بہہ کر گردن تک آ گیا تھا۔۔۔وہ شاید تڑپنے سے بھی بہت پہلے چند لمحات میں مر چکا تھا۔۔۔۔اس کے پھیلے ہوئے دائیں ہاتھ کی انگلیوں میں ایک شاپر تھا۔۔۔جس میں سستے سستے چتری والے آٹھ ، دس کیلے تھے۔ جن میں سے تین، چار شاپر سے نکل کر باہر سڑک پر بکھرے ہوئے تھے۔۔۔ لیکن اس کی شہادت والی انگلی نے شاپر کی طنابیں ابھی تک تھام رکھیں تھیں!!

☆☆☆☆☆

جیتی ہوئی ہار

میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور کاغذ قلم نکال کر کچھ لکھنے ہی والا تھا کہ اچانک وہ آن دھمکا۔ اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ انتہائی خوف زدہ لگ رہا تھا۔ میں نے نگاہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

''کیا ہوا؟''

اس نے میرے ہاتھ سے قلم اور کاغذ لے کر سائیڈ پر رکھا اور ڈرے ڈرے لہجے میں کہا۔

''میں بہت پریشان ہوں۔ کوئی مجھے مارنا چاہتا ہے۔''

میں نے پانی کا ایک گلاس اسے پیش کیا اور تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''دیکھو تم چھوٹی چھوٹی باتوں پر گھبرا جاتے ہو۔ مجھے پوری بات بتاؤ۔''

اس نے خوف زدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر دبی ہوئی آواز میں کہنے لگا۔

''تم شاید میری بات کو مذاق سمجھ رہے ہو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ اس بار معاملہ بہت سنجیدہ ہے۔ کوئی مجھے قتل کرنا چاہتا ہے۔ لیکن میں اپنے قاتل کو کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔''

میں نے چند لمحے اسے گہری نظروں سے دیکھا پھر رسان سے کہا۔

''تم اس قدر گھبرائے ہوئے ہو۔ اس طرح تم اپنے ممکنہ قاتل کو کیسے روکو گے۔''

اس کے چہرے پر غصے کے آثار نمودار ہوئے۔

''یہ تم کہہ رہے ہو؟ مجھے یقین نہیں ہوتا، تم تو میرے دوست ہو۔ تم میرے ساتھ ہو یا میرے قاتل کے ساتھ۔''

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔

''تم میرے دوست ہو اور زندہ سلامت میرے سامنے بیٹھے ہو۔ اسی لیے تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ اس وہم سے باہر نکلو۔ کوئی تمہارا دشمن نہیں ہے۔''

اس نے بے یقینی سے مجھے دیکھا پھر مجھے یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ کوئی اسے مارنا چاہتا ہے۔ جب میں نے پوچھا کہ وہ کون ہے جو تمہیں مارنا چاہتا ہے تو اس کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ ناراض ہو کر چلا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس کی ناراضی عارضی ہے۔ وہ پھر آئے گا۔ اسی طرح ہوا۔ لیکن دوسرے دن بھی ملتے ہی اس نے کہا کہ کوئی میرے پیچھے ہے۔ اس سے پہلے بھی وہ عجیب عجیب باتیں

وسیم جبران

کیا کرتا تھا مگر جلد ہی بھول جاتا تھا۔
میں نے اس بار بھی سمجھا بجھا کر اسے رخصت کیا۔ دو تین دن میں مصروف رہا اور اس سے مل نہ سکا۔ اس کے بعد وہ مجھے مارکیٹ میں ملا۔ مجھے ایک دوست کی شادی میں شرکت کرنی تھی۔ میں شیروانی خریدنے نکلا تھا۔ سپر مارکیٹ میں گاڑی پارک کر کے جیسے ہی میں گاڑی سے نکلا کسی نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ کھڑا تھا۔
''اچھا ہوا تم مل گئے میرے دوست۔ آج وہ میرا پیچھا کر رہا ہے۔''
میں نے اس کے پریشان چہرے کی طرف دیکھا۔ مجھے اس سے ہمدردی محسوس ہوئی۔
''کون پیچھا کر رہا ہے؟ کیا وہی جو تمہیں مارنا چاہتا ہے؟''
''ہاں وہی۔ وہ پچھلے کئی گھنٹے سے میرا تعاقب کر رہا ہے، کھل کر سامنے نہیں آتا۔ لیکن میں جانتا ہوں وہ میرے پیچھے ہے۔''
اس نے پھر دائیں بائیں دیکھا۔
''اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے بتاؤ۔ وہ کدھر ہے؟''
''ابھی تو بڑی مشکل سے میں نے اسے جل دیا ہے۔ مختلف گلیوں سے گزر کر یہاں پہنچا ہوں لیکن وہ جیسے ہی نظر آیا، میں تمہیں بتاؤں گا۔''
''وہ کیسا دکھائی دیتا ہے؟''
''ٹھیک سے بتا نہیں سکتا۔ وہ حلیے بدلتا رہتا ہے، کبھی کلین شیو ہوتا ہے، کبھی اس کے چہرے پر داڑھی ہوتی ہے۔''
''تم پولیس سے رابطہ کیوں نہیں کرتے۔ چلو میں تمہارے ساتھ پولیس اسٹیشن چلتا ہوں۔''
''نہیں نہیں۔ میں پولیس اسٹیشن نہیں جاؤں گا۔ ہمارے محافظ ہی اکثر قاتلوں اور ڈاکوؤں سے ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ کیا تم بھی مجھے قتل کروانا چاہتے ہو؟'' وہ بدک گیا۔
''اچھا چھوڑو۔ آؤ میرے ساتھ میں شیروانی خریدلوں، پھر تمہیں گھر چھوڑ دوں گا۔''
وہ میری بات سن کر مطمئن نظر آنے لگا۔ اسے اس کے گھر چھوڑ کر میں واپس چلا آیا۔ اس بار اس کا جنون بڑھتا جا رہا تھا۔ دوسرے دن شام کو وہ میرے گھر آیا تو بہت سنجیدہ تھا۔ اس کے چہرے پر گہرے تفکرات کی پرچھائیاں تھیں۔
''سنو میرا قاتل اکیلا نہیں ہے۔'' اس نے پرخیال لہجے میں کہا۔
میں اٹھ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر نرمی سے کہا۔
''کیوں نہ ہم کسی ڈاکٹر سے ملیں۔ میں تمہیں لے جاؤں گا''
وہ میری بات سن کر بھڑک اٹھا پھر غصے سے بولا۔
''تم کیا سمجھتے ہو، کیا میں پاگل ہوں یا مجھے کوئی نفسیاتی بیماری ہے۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ کتنی بار میں بتا چکا ہوں کہ میرا قاتل ایک حقیقت ہے۔ اور اس بار اس نے مجھے باقاعدہ دھمکی دی ہے۔''
میں چونک اٹھا۔ کیا واقعی اس بار وہ سچ بول رہا ہے۔
''کیا دھمکی دی ہے، کیا وہ تم سے ملا تھا؟''
اس نے میرے انداز میں ہمدردی پا کر

رازدارانہ لہجے میں کہا۔
"اس نے مجھے دھمکی آمیز خط لکھا ہے۔ آج صبح جب میں سو کر اٹھا تو میرے سرہانے ایک خط رکھا تھا۔ اس خط میں اس نے صاف صاف لکھا ہے کہ وہ مجھے کسی قیمت پر نہیں چھوڑے گا اور قتل کر کے رہے گا۔"
"تم مجھے وہ خط دکھاؤ۔ ہمیں اب پولیس سے ملنا ہی پڑے گا۔ ہم اس خط کی تحریر سے اندازہ لگانے کی کوشش کریں گے کہ تمہارا دشمن کون ہے۔"
"تم نے پھر ایسی باتیں شروع کر دیں۔ میں وہ خط تمہیں نہیں دکھا سکتا۔ اس نے یہ دھمکی بھی دی ہے کہ اگر کسی کو بتایا یا پولیس سے رابطہ کیا تو پھر میری لاش ہی ملے گی۔" وہ پھر بہتے سے اکھڑنے لگا۔
"تو پھر ایسے ڈر ڈر کر تم کیسے جیو گے۔ کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔"
اس کے چہرے پر ایک رنگ آ کر گزر گیا۔ پھر جیسے اس نے خود کو سنبھال لیا۔
"کچھ نہیں ہو گا۔ میرا قاتل بڑا چالاک ہے۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے ایسے مارے گا کہ کوئی اسے قتل ثابت نہیں کر سکے گا۔ لیکن میں اسے ہرا کر دکھاؤں گا۔ وہ مجھے قتل نہیں کر سکے گا۔"
"میرے دوست مجھے بتاؤ۔ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں۔"
اس نے امید بھری نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
"بس میرا ساتھ کبھی مت چھوڑنا۔"
میں نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا اور کہا۔
"تم نے کیسے سوچ لیا کہ میں تمہارا ساتھ چھوڑوں گا۔"
وہ مطمئن ہو کر چلا گیا۔ اس رات میں دیر تک اس کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ کس وہم میں مبتلا تھا۔ پھر اچانک مجھے خیال آیا۔ شاید وہ سچ کہہ رہا ہو۔ شاید واقعی اس کا کوئی دشمن ہو۔ ایسی صورت میں مجھے اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ مگر کیا کروں وہ کھل کر کچھ بتاتا بھی نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ صبح اس سے بات کروں گا۔ یہی سوچتے سوچتے میری آنکھ لگ گئی۔ لیکن ابھی کچی نیند میں ہی تھا کہ کسی نے زور سے دروازے پر دستک دی۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اتنی رات گئے کون ہو سکتا ہے؟
دروازہ کھولا تو وہ سامنے کھڑا تھا۔ میں نے جلدی سے اسے اندر بلایا۔ دروازہ بند کر کے میں نے اسے بیٹھنے کے لیے کہا۔
"اس وقت خیریت تو ہے؟"
اس کے چہرے پر گہرا اطمینان تھا۔ وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔
"فکر مت کرو۔ اب وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔"
"کیا مطلب؟ تم اپنے قاتل کی بات کر رہے ہو؟"
"ہاں اسی کی۔ میں نے اسے ہرا دیا ہے۔"
اسے پرسکون دیکھ کر میں نے بھی گہری سانس لی اور کہا۔
"اچھا۔ پورا واقعہ بتاؤ۔"

وہ ہاتھ سے اپنی گردن مسلتے ہوئے بولا۔
''آج شام جب میں گھر گیا تو وہ پہلے سے ہی گھر میں موجود تھا۔ لیکن میں بالکل بھی خوف زدہ نہیں تھا۔ میں اس کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کا یوں اچانک سامنے آجانا میرے لیے سرپرائز ہو گا۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ وہ ایسی ہی حرکت کرے گا۔ اسی لیے میں نے اس سے نبٹنے کا پلان بنا رکھا تھا۔ اس نے مجھے دیکھ کر پستول نکال لیا۔ اور بڑی بڑی باتیں کرنے لگا کہ وہ مجھے مار دے گا۔ میں بچ نہیں پاؤں گا۔ میں نے بھی لباس میں چھپایا ہوا بڑا سا چھرا نکال لیا۔ میں چھرا ہی تو تیز کروا کے گھر واپس آیا تھا۔ اس کے بعد وہ ہار گیا، اور میں جیت گیا۔''
وہ کہتے کہتے رک گیا اور فاتحانہ نظروں سے مجھے دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں پھیل گئیں۔
''اس کا مطلب ہے تم نے اسے قتل کر دیا۔ کیا کیا تم نے؟''
وہ میری بات سن کر ہنسنے لگا۔ پھر ہنستا ہی چلا گیا۔ اس کی ہنسی عجیب سی تھی اور تھمنے میں نہیں آرہی تھی۔ مجھے ایک لمحے کے لیے شبہ ہوا کہ وہ پاگل ہو گیا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے ہنسی روک لی۔ اب اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ پھر اس کے لب ہلے۔
''میرا قاتل پوری تیاری سے مجھے مارنے آیا تھا لیکن اس کی تیاری دھری کی دھری رہ گئی۔ اس نے پستول میری طرف تان رکھا تھا۔ گولی چلانے ہی والا تھا کہ میں نے تیز دھار چھرا نکال لیا۔ چھرا سے للکارا۔
''تم مجھے مار نہیں سکو گے۔ میں تمہارے ہاتھوں سے نکل جاؤں گا اور تم ہاتھ ملتے رہ جاؤ گے''
وہ میری بات سن کر ٹھٹک گیا۔ میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہ دیا اور چشم زدن میں چھرا اپنی گردن پر پھیر لیا۔ یقین کرو کہ اس کی آنکھوں میں شدید حیرت دیکھنے والی تھی۔ میری شہ رگ کٹ گئی تھی، میں فرش پر پڑا تھا اور سرخ سرخ خون سے قالین بھیگ رہا تھا۔ میرا قاتل پستول پھینک کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھ رہا تھا۔''
سرد لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں اتر گئی۔ میں نے بے یقینی کے عالم میں اسے دیکھا۔
''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ تم تو میرے سامنے بیٹھے ہو اور زندہ ہو۔''
اس نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔
''تم سے کس نے کہا کہ میں زندہ ہوں۔ میری لاش تو میرے گھر کے ڈرائنگ روم میں پڑی ہے۔ تمہیں یہی بتانے تو آیا ہوں۔ دوست اب دیر نہ کرو۔ تمہیں ابھی بہت سے کام کرنے ہیں۔ دیگر دوستوں کو اطلاع دینی ہے، کفن خریدنا ہے اور ہاں قبر بھی کھدوانی ہے۔ جلدی کرو میرے دوست۔ فون اٹھاؤ نمبر ڈائل کرو''
میرے بدن میں چیونٹیاں سی رینگنے لگیں۔ جسم جیسے شل ہو چکا تھا۔ وہ کیا کہہ رہا تھا مجھے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

☆☆☆☆☆

بچپن میں تعبیر بنا کے رکھ لی تھی

شاعرِ امروز

علی ادراک

شاہد ماکلی

علی ادراک جیسے نوجوانوں کی غزل پڑھ کر، شاعری پر ہمارا اعتماد بحال ہوتا ہے---- وہ اعتماد جو اس وقت دنیا کی برق رفتاری کے غبار میں کہیں کھو چکا ہے۔ علی ادراک کی غزل پڑھ کر یقین کی وہ چنگاریاں ہمارے اندر ہمکنے لگتی ہیں جو موجودہ صورت حال سے پیدا ہونے والے گوناگوں اندیشوں اور گمانوں کے خس و خاشاک تلے دب چکی ہیں۔ علی ادراک کی غزل پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ شعری استعداد اور تخلیقی شعور و ادراک بلاشبہ خدا داد ہوا کرتے ہیں۔ اچھا شعر کہنے اور پھر مسلسل اچھا شعر کہنے کا وفوری عمل، علی ادراک کے لیے ایسے ہے جیسے کسی چشمے کے لیے پتھریلی زمین سے پھوٹنے کا عمل---- یا جیسے کسی کونپل کے لیے ضربیلی ٹہنی سے پھوٹنے کا ابھیاس۔

علی ادراک کے تخلیقی عمل کی سب سے بڑی خوبی، معیّن و مروّج معنی کی تقلیب ہے جس کے پیچھے اس کی وہ خداداد حسّیت کارفرما ہے جو چیزوں کو ویسا نہیں دکھاتی جیسی کہ وہ ہیں یا جیسا کہ وہ اب تک ہمارے رسمی و کلیشیائی احساسات کا حصہ بن چکی ہیں---- بلکہ یہ حسیت ہمیں چیزوں کا وہ نامعلوم پہلو محسوس کراتی ہے، جس کا ذائقہ ہمارے معلوم تجربے کا حصہ نہیں ہے اور جس سے ہم پہلی بار دوچار ہو رہے ہوتے ہیں۔

وہ 12 ستمبر 1989 کو پتوکی میں پیدا ہوئے۔ صفائر لاہور میں جاب کرتے ہیں۔ 2018 سے شعر گوئی کا آغاز کیا۔ ذیل میں ان کے چند منتخب اشعار:

بچپن میں تعبیر بنا کے رکھ لی تھی
خواب تو میں نے برسوں بعد بنایا ہے

ہم اگر مرتے رہے یونہی خدا کے نام پر
دیکھنا اک دن زمیں پر بس خدا رہ جائے گا

دائروں میں چل رہے ہیں اور دنیا گول ہے
مختلف سمتوں سے آتے ہم کہیں ٹکرائیں گے

ہے انتظار مجھ کو مناسب سے وقت کا
میں پھر رہا ہوں ہاتھ میں اک حادثہ لئے

بھائی بھائی میں فرق ہوتا ہے
آپ قابیل ہی کو لے لیجے !

کب کہاں رات کاٹنی ہو مجھے
داستاں ساتھ لے کے پھرتا ہوں

وقت کے ساتھ بھولتے ہی گئے
گرد اوپر مزید گرد پڑی

اک تیزی منزل سے آگے لے جاتی ہے
پھر سے دنیا گھوم کے آنا پڑ جاتا ہے

اتنی بھیڑ کہ آنکھیں ہاتھ پہ رکھ لی تھیں
دیواروں کو چھو کر گھر تک پہنچے ہیں

اب تو دشوار نہیں سمت معیّن کرنا
وہ مرے سامنے ہے قطبی ستارے کی طرح

ایسے ڈرتا ہوں اب محبت سے
آگ کا ہو گمان جگنو پر

بعد میں دشمنوں کی باری ہے
پہلے کچھ یار آزمائیں گے

جو گرا کر نکل گئے آگے
خاک رفتار آزمائیں گے

کئی تو آنکھیں ہی پھوڑ بیٹھے بغیر دیکھے
کہیں پہ اندھوں نے تیری صورت پہ گفتگو کی

میں آگ، پانی، ہوا، عناصر کی ساری پرتیں تو کھول بیٹھا
خدا کے عقدے تو ایک صورت کی بے حجابی سے کھل رہے ہیں

اس سے پہلے پہنچا ہوں میں منزل پر
جس نے آدھے رستے ہاتھ چھڑایا ہے

خواب لے کر چلا گیا کوئی
میرے تکیے پہ رہ گئیں آنکھیں

انہیں میں پاؤں کا مطلب کبھی سمجھا نہیں سکتا
اگر بستی کے لوگوں کو سہولت رینگنے میں ہے

یہ بھی نعمت ہے کہ آتی ہے مصیبت مجھ پر
بچ نکلنے کا نیا کوئی سبب کھلتا ہے

وہیں وہیں پہ مری خاک اڑتی رہتی ہے
جہاں جہاں بھی تمہاری فضا میں سانس لیا

تم کہانی میں پہنچے ہو تاخیر سے
اس سے پہلے بہت مسکراتا تھا میں

اے آسماں، ذرا ترے ہٹنے کی دیر تھی
پیروں تلے سے دیکھ! زمیں کھینچ لی گئی

پہلے جو اک سہولتِ گریہ تھی پیشِ یار
اس بار ہم سے وہ بھی کہیں کھینچ لی گئی

فون میں رابطے ہزاروں ہیں
بات کرنے کو ایک شخص نہیں

تھوڑا آگے نکل کے ہنسنے لگے
دل گرفتہ جو سانحے پر تھے

ہم اس جہاں سے رہائی پائیں تو کیا نیا ہو
کہ اگلی جیلوں میں بھی تو جیلر خدا رہے گا

اُلٹی جانب چلنے والے کتنا سیدھا چلتے ہیں
کتنی مشکل آ جاتی ہے سیدھی جانب چلنے میں

بُنا سپنوں کی یہ آنکھیں، بھلا کیا فائدہ اِن کا
پرندوں کے بُنا تو گھونسلے بیکار ہوتے ہیں

پھول آخر بکھر ہی جائیں گے
اور تتلی چمن بدل لے گی

تُو مسافر ہے ریل گاڑی کا
تیرے منظر بدلتے رہتے ہیں

لوگ جتنے بھی حادثے پر تھے
ہاتھ سب کے ہی کیمرے پر تھے

گھیر لیتے ہیں وسوسے دل کو
آپ نمبر بدلتے رہتے ہیں

میں لاکھ پردوں میں جا کے روؤں، مجھے یقیں ہے
ہر ایک ہچکی ضعیف ماں تک پہنچ رہی ہے

جو جس کے ساتھ ہے، اسی کے ساتھ اٹھے گا
یہ دل تری مصاحبی کے ساتھ اٹھے گا

تن کر اٹھیں گے لوگ ترے احترام میں
بندہ ترا خمیدگی کے ساتھ اٹھے گا

تعبیر پھر سے ہے وہی، اے خوابِ خوش خیال
اک سانپ تازہ کینچلی کے ساتھ اٹھے گا

☆☆☆☆☆

بچھڑنے والوں نے آپس میں دوستی کر لی

شاعرِ امروز

شاہد نواز

شاہد ماکلی

شاہد نواز کی غزل جن موضوعات کا احاطہ کرتی ہے، ان میں رومان پرور فضا کے خدوخال کی ناتمامی کا اظہاریہ، غالب موضوع کے طور پر سامنے آتا ہے۔ وہ اپنی ذات میں گم رہ کر اندر ُونے کے ملال سے مسرّت کا رس کشید کرنے والے لیکھک ہیں۔ ایک ایسے چتر کار ہیں جو اپنے تصور میں بسی ہوئی تصویروں کو انوکھے اور اچھوتے رنگوں کے ساتھ پوری خلاقی اور مشاقی سے کینوس پر منتقل کر دیتے ہیں۔ ان کے ہاں ایسے کئی اشعار کا ذخیرہ موجود ہے جو اپنے موضوع، طرزِ احساس اور پیش کاری کے لحاظ سے نیا نکور اور پُرتاثیر ہے۔ تُو بہ تُو مشاہدے کے زیرِ اثر، ارسال المثل کی صنعت اور تمثیلی استدلال کا مؤثر برتاؤ بھی ان کے ہاں خاطر خواہ ملتا ہے جس سے ان کے اشعار میں زور بیان کے ساتھ ساتھ ایک طرح کی محاکاتی ندرت پیدا ہوئی ہے۔

شاہد نواز 30 دسمبر 1995 کو جھنگ میں پیدا ہوئے۔ حافظِ قرآن ہیں۔ بی ایس انگلش لٹریچر کیا ہوا ہے۔ ذیل میں ان کا شعری انتخاب:

میری قسمت میں نہیں پہلی ملاقات کا رس
جس سے ملتا ہوں، وہ پہلے بھی ملا ہوتا ہے

بچھڑنے والوں نے آپس میں دوستی کر لی
یہ پہلی بار محبت میں کچھ نیا ہوا ہے

ہمارا کام فقط دل کو فتح کرنا تھا
اب آگے جشن کا اعلان تم نے کرنا ہے

یہ اور بات کہ تم دل پہ لے گئے ہو اسے
وگرنہ چوٹ زیادہ نہیں لگی مجھ کو

چلتے چلتے ہی کوئی میری تھکن دُور کرے
میں نے گٹھڑی تو کبھی سر سے اتاری نہیں ہے

جانے کس رنگ کے برتن میں انڈیلے گا ہمیں
پانی کی طرح کوئی شکل ہماری نہیں ہے

اچھا ہے ، خشک ہو گیا دریا
ناؤ میں پار کرنا پڑتا تھا

ہم برا سوچ ہی نہیں سکتے
اور بھلے کا زمانہ کوئی نہیں

دریا میں ہاتھ پاؤں نہیں مارنے پڑے
اک لہر ایسی جاری و ساری ملی ہمیں

چراغ لائے تھے جس کام کے لیے، وہ کام
اندھیرا ہونے سے پہلے ہی کر لیا اس نے

اب عمارت کہیں گرے تو ہم
سببِ انہدام بتلائیں

یہ تعلق کھلا تضاد نہیں!
میرے دشمن ہیں میرے یار کے دوست

کچھ ترے ملنے ملانے سے بھی نیت بدلی
کچھ بخارات تو پانی سے بھی پہلے کے ہیں

دل سے بھلا دیا تو ہمارا ہوا کوئی
رستے سے ہٹ گئے تو سواری ملی ہمیں

ورنہ یہ نیند ٹوٹ جائے گی
تم کوئی خواب دیکھتے رہنا

یاد رہتا نہیں تھا نام اپنا
دستکوں سے مکرنا پڑتا تھا

اور کوئی راستہ نہیں ہے کیا
کیا اسی میں بھلائی ہے اپنی

رہ کی دیوار جانتا ہوں جنھیں
جانے کب راستے میں آئیں گے

ایک دم تم پہ کھل بھی جائیں اگر
رفتہ رفتہ سمجھ میں آئیں گے

ہوش میں آیا جب عدو تو اسے
ڈھال کے فائدے بتائیں گے

یہ دیکھنے کو میں پسِ پردہ چلا گیا
منظر پہ رہ کے ہاتھ سے کیا کیا چلا گیا

نفسِ مضمون کو تہہ دار بناتے ہوئے ہم
سطح پر آ گئے گہرائی بتاتے ہوئے ہم

ڈوب کر پار اترنے میں سہولت ہے ہمیں
ناؤ رکھتے ہیں مگر پاسِ روایت ہے ہمیں

لڑی میں کیسے پروتا ہوں موتیوں کو میں
دیا بجھا دے ، اگر کام دیکھنا ہے مرا

تو کیا برائی ہے اب اس کو آزمانے میں
کہ اعتبار تو ویسے بھی اٹھ گیا ہے مرا

نذر دنیا ہوئے جاتے ہیں تمہاری خاطر
تم سمجھتے ہو کہ اشیا سے محبت ہے ہمیں

مجھے پتہ ہے یہ رستہ کہیں نہیں جاتا
مجھے پتہ ہے مگر کیا کروں کہاں جاؤں

نئے پرانے سبھی گوشوارے دیکھنے سے
خسارے کم نہیں ہوں گے خسارے دیکھنے سے

بہت ہی گہرا کوئی خالی پن ہے آنکھوں میں
یہ جانے والا نہیں ہے تمھارے دیکھنے سے

تُو ایک بار سفر کر کے دیکھ لے مجھ پر
رہ فرار سہی ، راستہ تو میں بھی ہوں

اب کناروں سے نکل آیا ہے باہر دریا
اب کہیں سے بھی اترنے کی سہولت ہے ہمیں

یہ بھی ٹھوکر ہے بھیڑ میں شاہد
کوئی کاندھا نہیں لگا مجھ کو

اسی طرح دیکھتے رہو تو کہیں نہیں دیکھنا پڑے گا
اسی طرح سانس لو تو ہر دن الگ طرح کی فضا ملے گی

مجھ کو پتھر پہ کیوں نہیں کھینچا؟
ایک مٹتی لکیر نے پوچھا

آٹھ آنے کے ایک سکّے میں
کیا دعا دوں ، فقیر نے پوچھا

قید سے کیوں رہا کیا ہے مجھے
جرم کیا ہے، اسیر نے پوچھا

چل نہیں سکتے تو رکنے کا بہانہ کیسا
راہ کو پاؤں کی زنجیر بتانا کیسا

کس قدر روشنی باقی ہے مری آنکھوں میں
شام کا وقت ہے ، اندازہ لگانا کیسا

جب اجازت ہے تو پھر چوری چھپے کیا ملنا
باغ میں رہتے ہوئے پھول چرانا کیسا

☆☆☆☆☆

حد

سوچا بہت، پہ کھل نہ سکا آج تک، کہ کیوں
کرتے ہیں لوگ اپنی اناؤں کا قتلِ عام
چہروں پہ نقش ہوتی سیاہی کو بھول کر
دوڑے چلے ہی جاتے ہیں بے سمت، بے لگام

یہ سارا اہتمام وہ کرتے ہیں کس لیے؟
ہیں ان کے جتنے خیر طلب اُن کو چھوڑ کر
سایوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں کس لیے؟

یہ بھی نہیں کہ ان کو نہیں انت کی خبر
دن رات ان کے سامنے جاتے ہیں ان سے لوگ
زیرِ زمین ڈھیر سی مٹی لیے ہوئے
جس ہاتھ میں تھیں سارے خزانوں کی کنجیاں
اب اُس میں ہے بس ایک عجب مستقل ساڈر

خدمت میں ان کی مست تھے بڑھتے ہوئے جو صفر
اب اُن سے ان کا رابطہ باقی نہیں رہا
اب وہ بھی اپنی اصل میں ہیں بسکہ ایک صفر
جس کو کوئی فقیر بھی لیتا نہیں وہ صفر

چیزوں کا یہ جہان ہے بس ایک واہمہ
ایسا نگر کہ جس میں کوئی نیک و بد نہیں
اک گونج سی ہے شہرِ خموشاں میں چار سُو
جس کا ازل تو ہے کہیں لیکن ابد نہیں
کرتی ہے اس سوال کو حل ایسے زندگی
اتنے بڑے جہاں میں کہیں جس کا رد نہیں

تنکا بھی ایک، ساتھ کوئی لے نہیں گیا
اس سے بڑی تو وقت کی کوئی سند نہیں
لکھا ہوا ہے ہر کسی لوحِ مزار پر
"دولت کی حد ہے پر کوئی لالچ کی حد نہیں"

امجد اسلام امجد

ابھی کچھ دیر ہے

ابھی کچھ دیر ہے آندھی کے چلنے میں
یہ گہرے حبس کا موسم بدلنے میں
ابھی کچھ اَور بے پَر کی اُڑا لیں
اور ممولوں کو لڑا لیں
پتنگیں لُوٹ لیں
لٹّو گھما لیں
کہ پھر موقع نہیں ہوگا تماشے کا
پٹاری سے نہ جانے
سانپ نکلے یا کبوتر
سو لازم ہے کہ دل تھامے رہیں سارے تماشائی
ابھی کچھ وقت ہے یہ رات ڈھلنے میں
ابھی کچھ دیر ہے سورج نکلنے میں

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہر قدم جاری تھی نادیدہ سہاروں کی تلاش
ہر قدم منت کشِ اغیار ہونا تھا ، ہوے

خدا سے کہنا

خدا سے کہنا
کہ تیرے بندے
فضائے گوفہ میں جی رہے ہیں
صدائے گریہ چہار جانب
کہیں کہیں کوئی گل ہے
ورنہ تو باغ سارا اُجڑ گیا ہے
رَفو گری اتنی بے ہُنر تھی
لباسِ دِل کا ہر ایک ٹانکا اُدھڑ گیا ہے
صَبا پہ صَرصَر کا خوف طاری
اُداس، پھولوں کے سارے تختے
ملُول غنچے، اُجاڑ کیاری
یہ پتی پتی گُلاب زخموں کو رو رہے ہیں
عجیب رُت ہے
تمام آئینے زنگ آثار ہو رہے ہیں
یہ بات بھی اِبتدا سے کہنا
خدا سے کہنا
کہ چاند گہنا گئے ہیں اپنے
وہ چاندنی جو نکور کرتی تھی جسم و جاں میں
کہاں ہے جانے قیام اُس کا
بہار بھی تھی کبیدہ خاطر، سو جا چکی ہے
خزاں کی فرماں روائی میں
خشک، زرد، سوکھے ہوئے یہ پتے
زمین پر شور کر رہے ہیں
نہیں ہے کوئی مقام جس پر
طُیور کے گھر بنائے جائیں
یہاں پہ ہر کوئی اپنی دھن میں
مگن ہے، کس کو
محبتوں کے مُدھر ترانے سنائے جائیں
خدا سے کہنا
بہت ہی دشوار ہو گیا ہے
یہاں پہ رہنا
مرے سُخن پر یقیں نہیں تو
خود آسماں سے اُتر کے آئے
ہماری دھرتی کا حال دیکھے
اکھڑ رہی ہیں زمیں کی سانسیں
فراتِ ہستی پہ لوگ پیاس اور بھوک سے
جان دے رہے ہیں
وہ ناخداؤں کو زندہ رہنے کا سُرخ تاوان
دے رہے ہیں

تابش کمال

افتادِ بے داد

طالب انصاری

گزشتہ زمانوں کے پتھ پر
خیالوں کے لچھے بناتا ہوا میں
کدھر سے کدھر آ گیا ہوں
ابھی تو سویرے نے چہرے سے کمبل ہٹایا نہیں ہے
ابھی تو
درختوں پہ چڑیوں کی چہکار بھی خامشی میں
پڑی سو رہی ہے
ابھی تو گلی کی سبھی کھڑکیاں اونگھتی ہیں
اذانوں کی آواز بھی تو نہیں آئی ہے
بوڑھے جاروب کش بھی ابھی بستروں میں
پڑے کروٹیں لے رہے ہیں
میں اتنا سویرے تو اُٹھنے کا عادی نہیں تھا
مگر زندگی، تو نے کولہو میں جوتا
مری دونوں آنکھوں پہ کھوپے چڑھائے
مجھے اپنے خوش کن مناظر کی شیتل ہواؤں سے باہر نکالا
کڑی دھوپ کی دھول کے تہ بہ تہ کتنے ردّے جمائے
میں ہر روز روزی کے چکّر میں چک پھیریاں کھاتا
اک دائرے میں سفر کاٹتا ہوں
کبھی تھک کے ٹھہروں
ضرورت کا کوڑا مری پیٹھ پر آ برستا ہے
یہ افتادِ بے داد کوئی خزانہ نہیں ہے
مجھے ایسا لگتا ہے جیسے
یہ میرا زمانہ نہیں ہے

لہو رنگ [سانحہ کوچہ سالدار کے شہداء کے نام]

کیفی قلندر

سبز رتوں میں
رنگ بسنتی
پھیل رہا تھا
پھولوں کے کھلنے کا موسم
آ پہنچا تھا
پنچھی اپنی اپنی سر میں
گیت بہار کے چھیڑ رہے تھے
ہونٹوں پر مسکان سجائے
تیرے نمازی، تیرے در پر
آ پہنچے تھے
یکدم اک آواز ہوئی اور
سارا منظر بدل گیا تھا
پنچھی خوف کے مارے اپنے
سارے نغمے بھول گئے تھے
پھول ہوا میں بکھر گئے تھے
اڑ گئے سارے رنگ سنہرے
ایک لہو کا رنگ رہ جائے
جسکو دیکھ کے مالک تو بھی
دنگ رہ جائے
دنگ رہ جائے

سالگرہ

وہ بھی دن تھے
پل پل خوشیاں
میرے پیچھے پھرتی تھیں
وہ خوشیاں جھولی میں بھر کے
میں اتراتی پھرتی تھی
کتنے دن ہی پہلے،
اس کا میسج آنے لگتا تھا
آج تمھاری سالگرہ ہے
بولو! جو کچھ بھی تم مانگو گی
ٹی سی ایس کروادوں گا
شاید میں گلدستہ بھیجوں!
ایڈریس اپنا، دے دو ناں!
میں اک پریم دوانی ٹھہری
جھٹ سے یہ کہہ دیتی تھی
کیا کرنی ہیں چیزیں ویزیں
کیا پھولوں کا کرنا ہے!
بس تم خود ہی آجانا
اپنا مکھ دکھلا جانا
بدلے دن،
پھر وہ بھی بدلا
اپنی دھن میں رہتا ہے
بھول کے مجھ کو،
ہر لڑکی سے
ہنس ہنس باتیں کرتا ہے
آج اکیلی سوچ رہی ہوں
سالگرہ کیا کرنی ہے
کیک سے اچھی چائے ہے
منظر ڈھیر دکھاتی ہے
دکھ میں ساتھ نبھاتی ہے

☆☆☆☆☆

کوکی گل

نثری نظم

کوئی کتاب ہم ایک ہی نشست میں پڑھ کر اٹھتے ہیں
دلچسپی اسکی پرتوں سے نظر نہیں ہٹنے دیتی
کہانی کا اختتام تک ساتھ رہتا ہے
اور کچھ کتابیں سرہانے دھری رہتی ہیں
انکے لمس سے روح کو سرشار کرتے ہیں
لفظ لفظ کی حرمت کو نگاہوں سے بوسہ دیتے ہیں
تشنگی نہیں بجھتی
ہر روز معانی کے سمندر میں ڈوبنا ابھرنا
جذبوں سے سرشار ہونا اچھا لگتا ہے
یکمشت پڑھنے میں وہ لذت نہیں رہتی
انہیں تو روز پڑھنے میں ہی سرشاری میسر ہے
انہیں ہم روز پڑھتے ہیں
سرہانے دھری کتابیں
بہت عزیز ہوتی ہیں

نائلہ راٹھور

بسترِ مرگ

(Thomas Hood کی نظم "The Death-bed" کا اردو ترجمہ)

غلام مرتضیٰ

سانس لیتے ہوئے شب ہم نے اُسے دیکھا تھا
اس کی ہر سانس بڑی نرم، بہت دھیمی تھی
اور چھاتی میں دبی زیست کی اک لاغر موج
کبھی اندر کبھی باہر کی طرف آتی تھی

اور پھر صبح ہوئی درد کی، بے نور، اداس
مینھ کی بوچھاڑ سے بھیگی تھی قبا سردی کی
ریشمی، نرم پپوٹے تھے حسین آنکھوں پر
اب کہیں اور سحر ہوگی، جہاں جاگے گی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

وہ ایک بات میں ہر بات بھول جاتا ہے
ہوائیں جیسے ہواؤں سے لڑنے لگتی ہیں

خطوط

شہزاد نیّر

محترم عمران منظور

السلام علیکم

خوشی کی بات ہے کہ ہم سب کے محبوب رسالے بیاض پر ایم فل کی سطح کا کام ہوا۔ محترم خالد احمد کی روح ضرور خوش ہوئی ہوگی۔ اس رسالے نے بے شمار نئے لکھنے والوں کو اعتماد اور وقار بخشا۔ میرا شمار بھی بیاض کے خوشہ چینوں میں ہوتا ہے۔

مجھے اپنی کوتاہی کا احساس بھی ہے کہ تواتر سے تحریریں نہ بھیج سکا۔ تاہم وقتاً فوقتاً حاضری پیش کرتا رہا۔

"ادب لطیف" کا نائب مدیر بننے کے بعد عملی طور پر مجھے علم ہوا کہ ادبی رسالہ چھاپنا کس قدر کٹھن کام ہے۔ آپ تو غیر منقطع استمرار و استقرار کے ساتھ بیاض چھاپ رہے ہیں۔ اب میں جناب خالد احمد اور ان کے بعد آپ کی جدوجہد کی صحیح معنوں میں تفہیم کرنے کے قابل ہوا ہوں۔

اس چراغ کے لیے اور آپ کے لیے نیک خواہشات۔

ایک مختصر مضمون اور ایک تازہ ترین غزل حاضری کے لیے پیش ہے۔

طالب انصاری

برادر مکرم عمران منظور صاحب

مسنون سلام اور بہت احترام

"بیاض" کا شمارہ بابت مئی 2022 باعثِ فرحت دل ہوا۔ اس نوازش پر آپ کے لیے کلماتِ تشکر اور دعائیں عید کی چھٹیوں کی وجہ سے اس مرتبہ "بیاض" آٹھ مئی کو یعنی تاخیر سے موصول ہوا۔ اس لیے تاحال پرچہ زیرِ مطالعہ ہے۔ البتہ شری مرلی چند کا اردو کی بھلائی کے حوالے سے لکھا گیا مضمون "اردو بولی" پڑا ہے۔ اردو وہ بدقسمت زبان ہے، جو اپنے گھر میں ہی لاوارث بنا دی گئی ہے۔ استعمار نے غلامی کے شکنجے کو مضبوط کرنے کے لیے وطنِ عزیز میں جگہ جگہ انگریزی ذریعہ تعلیم والے سکولز کھول کر اس بات کا واضح ثبوت دے دیا ہے کہ پاکستان سے مسلم شناخت کو ہی ختم کرنے کے درپے ہے۔ مُرلی صاحب کا یہ کہنا درست ہے کہ اردو زبان پاکستان کے چاروں صوبوں کے مابین یک جہتی کی علامت ہے۔ ہمارے یہ چار صوبے ثقافتی اور لسانی سطح پر ضرور الگ شناخت رکھتے ہیں، لیکن ان میں مذہب اک مضبوط قدر مشترک ہے، جسے انگریزی کی یلغار سے ختم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ چوں کہ عالمی سطح پر مذہب ایک ڈھیلا ڈھالا حوالہ بنا دیا گیا ہے، اس لیے پاکستان کی چاروں اکائیوں کو متحد رکھنے میں زبان کلیدی کردار ادا کر سکتی ہے۔ اردو کی ہمہ گیریت نے ہی اسے یہ مقام دیا ہے کہ اسے پاکستان کی قومی زبان ہونے کا اعزاز دیا جائے۔ پاکستان کے قدر دانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اردو کو دفتری زبان بنانے کی کوششوں کو تیز تر کریں۔ آخر ہم کب تک انگریزی زبان کا پٹہ گلے میں ڈالے سرگرداں رہیں گے۔

دیگر مضامین اور مندرجات ابھی تشنۂ مطالعہ ہیں۔ اس خیال سے کہ اگلے شمارے میں کہیں غیر حاضری نہ لگ جائے مزید تبصرہ سے گریز کرتے ہوئے اپنی ایک نظم ملفوف کر رہا ہوں۔ شفقت حیات شفق صاحبہ کی بھی ایک غزل منسلک ہے۔ شاید میں اس سے پہلے ذکر چکا ہوں کہ شفقت حیات صاحبہ ایک گھریلو خاتون ہیں گھر سے کم کم باہر نکلتی ہیں۔ ان کے لیے ممکن نہیں کہ ڈاک خانہ جا کر خط سپرد ڈاک کریں۔ یہ غزل بھی انھوں نے مجھے بذریعہ برقی مراسلہ بھجوائی کہ اپنے خط کے ساتھ اسے بھی منسلک کر دوں۔ احباب بیاض کی خدمت میں سلام۔

اشرف کمال

محترم عمران منظور نعمان منظور صاحب

السلام علیکم

ماہنامہ "بیاض" کا مئی کا شمارہ موصول ہوا۔ خوبصورت عید مبارک کی خوش کن تحریر کے ساتھ۔ حسب روایت یہ شمارہ حمد، نعت، بھرپور غزلوں اور نظم و نثر پر مبنی ہے۔ لیے ہوئے ایک ادبی شمارہ۔ شاعری کے علاوہ افسانوں اور مضامین کا خوبصورت انتخاب کیا گیا ہے۔

رسالہ کھولتے ہی دوسرے صفحے پر موجود خالد احمد کی نظم "دیمین" اور "تحصیر" موجود ہے۔

تحصیر کے اشعار دیکھیے:

لوگ ہوں یا اجرام خلائی
صرف اصولوں کو ہے دوام
ہر سیارے کا اک محور
ہر تارے کا ایک مقام

اس شمارے میں بھی حسب سابق بڑی بھرپور غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ فوری طور پر درج ذیل شعروں کو بھا گئے:

بے آس ہو گئے ہیں ہم اس مہربان سے — پھر بھی کسی طرح نہیں جاتا وہ دھیان سے (انور شعور)

بہت ہی احسن طریقے سے بنے تھے — مگر ہم لوگ کیسے ہو گئے (محسن اسرار)

کچھ خط پرانے دیکھ رہا تھا میں رات کو — اک خط میں دیکھا خشک سا پتا، میں رو پڑا (ناصر علی سید)

چراغوں کو بھی مشکل ہو رہا ہے سانس لینا — کئی دن سے دریچوں میں ہوا کوئی نہیں ہے (خاور اعجاز)

تمھارا چھونا میری روح کی شفا ٹھہرا — تمھارے دیکھنے سے زخموں کا اندمال ہوا (اعجاز رضوی)

گلی پہ کھلنے لگا نیم وا دریچہ بھی — چراغ جلنے لگا ہے، ہوا نہیں ہے تو کیا (خورشید ربانی)

آنے پہ جس کے ہوگا ہنگامہ — وہ نہیں آیا پھر تو کیا ہوگا (زبیر فاروق)

کوئی ستارہ مجھے مل نہیں سکا اب تک — ہزار چھان کے بیٹھا ہوں آسمان کو میں (نعیم رضا بھٹی)

ہم اہل درد پکارے گئے صحیفوں میں — ہم اہل عشق اتارے گئے کتاب کے ساتھ (زعیم رشید)

میں خود پہ کھل رہا ہوں دھیرے دھیرے — تمھارے آئنے میں آ گیا ہوں (عاصم اعجاز)

نسائی لہجے میں درج ذیل اشعار خوب ہیں:

فیض پایا تری صحبت ہی سے ملتی ہے مجھے — کب ترے عشق کی تاثیر نہیں چاہتی میں (نادیہ عنبر لودھی)

اس نے میرے اندر سے — کوئی چیز چرالی ہے (عنبرین خان)

نہیں آسان تمھارا ملنا — نہیں آسان جدا ہونا بھی (شبہ طراز)

اک بار ذرا ہاتھ تو اس نبض پہ رکھئے ہوجائے گا پھر اچھا بھلا آپ کا بیمار (رخشندہ نوید)
درد سے آشنائی دیتی ہے گر محبت رہائی دیتی ہے (رخسانہ سمن)
خار دنیا سمجھ رہی ہے مجھے اپنے بابا کی تو چنبیلی ہوں (نادیہ سحر)

جلیل عالی، نسیم سحر، آسناتھ کنول، گلزار بخاری، نائیلہ راٹھور، اعجاز دانش، ظہور چوہان، اکرم جاذب، اور دیگر شعرا کی شاعری بھی قابل ذکر ہیں۔

ماہنامہ بیاض اور انتظامیہ کو خراج تحسین کہ اس دور ابتلا میں بھی ہر ماہ بڑی باقاعدگی سے خوبصورت تخلیقات پیش کرنے میں پیش پیش ہے۔

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحب

السلام علیکم!

مئی کا شمارہ خلاف معمول عید کے بعد 6 مئی کو ملا۔ حافظ صاحب کے بقول 30 اپریل کو پوسٹ ہو گیا تھا، مگر یکم مئی سے عید کی چھٹیوں کی وجہ سے یہ صورتحال بنی۔ جبکہ 'بیاض' کی یہ روایت ہے کہ یہ ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو اپنے قاری کے ہاتھوں میں ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ 'بیاض' کی علمی و ادبی خدمات پر تحقیقی و تنقیدی مقالہ لکھا گیا۔ اس کے لیے جہاں 'بیاض' کی انتظامیہ اور 'بیاض' کے لکھاری مبارکباد کے مستحق ہیں۔ وہیں مقالہ نگار اور نگران مقالہ کی کوششوں کو بھی سلام پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں کسی ادبی مجلے کی پذیرائی کا رجحان بہت کم ہے۔ گزشتہ دنوں لاہور میں قائداعظم لائبریری جانے کا اتفاق ہوا تو لائبریری انچارج محترمہ ذکیہ مراد سے ملاقات ہوئی۔ انھیں اپنی کتاب پیش کی۔ گفتگو کے دوران انھوں نے بتایا کہ ہمارے مجلے ''محزن'' پر پی ایچ ڈی کی سطح کا مقالہ لکھا جا چکا ہے۔ کتابی صورت میں مقالے کو دیکھ کر نا قابل بیان خوشی ہوئی۔ ادبی مجلے شائع کرنے والے، علم و ادب سے وابستہ ان لوگوں کی قدر کی جانی چاہیے۔ ان لوگوں کے کام کو سراہنے کا ایک طریقہ ہے کہ ان پر تحقیقی مقالہ جات لکھے جائیں۔

مختلف کتابوں پر دلچسپ تبصرے پڑھنے کو ملے۔ ایک بیٹے کے ماں کے لیے جذبات ''ماں لوٹ آؤ'' میں پڑھنے کو ملے۔ طلعت شبیر کے جذبات و احساسات دل کے بہت قریب لگے۔ میں نے جنت نہیں دیکھی ماں دیکھی ہے۔ ماں اپنی اولاد کے لیے سراپا دعا ہوتی ہے بقول شاعر:

میرے دن کی طرح روشن میری ہر بات ہوتی ہے
دعا ماں کی ہر اک موسم میں میرے ساتھ ہوتی ہے

''مکالمے کی اہمیت و ضرورت'' پر سید تحسین گیلانی نے ایک معلوماتی تحریر لکھی۔ محمد کلیم نے ''ابو جی'' کی صورت اپنے والد کی زندگی کی دلچسپ باتوں کو یاد کیا۔ اس دفعہ جو غزلیں پڑھیں ان کے یہ اشعار پسند آئے۔

کاغذ پہ کس نے کیا ہے لکھا، دیکھتی نہیں چلنے کے بعد مُڑ کے ہوا، دیکھتی نہیں (اسلام عظمی)
میں انکشاف کروں گا اگر سوال ہوا کہ راز رکھنا میرے واسطے وبال ہوا (اعجاز رضوی)
درد بچپن سے ساتھ ہے میرے درد کی گود ہی میں کھیلی ہوں
کوئی آکر بسا نہیں جس میں میں وہ سنسان سی حویلی ہوں (نادیہ سحر)

حمیرا راحت، عنبرین صلاح الدین اور امجد بابر کی نظمیں بھی اچھی لگیں۔

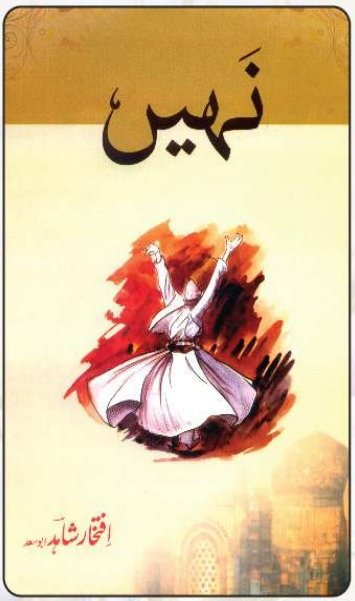

نہیں
افتخار شاہد ابوسعد

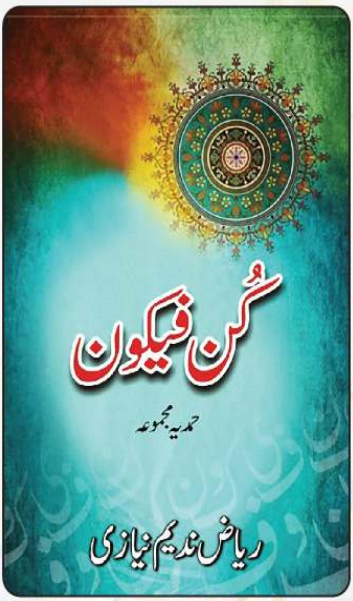

کُن فیکون
حمدیہ مجموعہ
ریاض ندیم نیازی

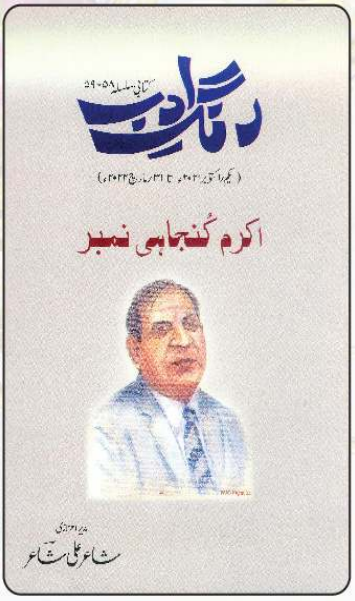

رنگِ ادب
اکرم کُنجاہی نمبر
مدیر اعزازی
شاعر علی شاعر

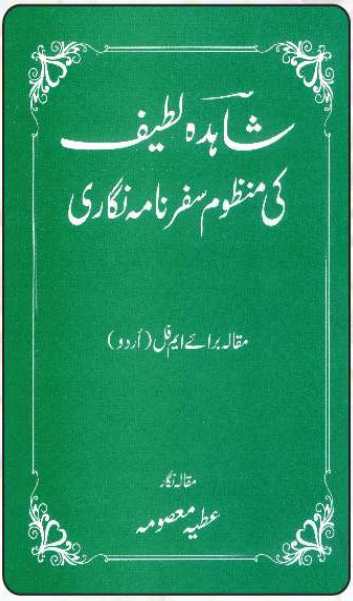

شاہدہ لطیف
کی منظوم سفرنامہ نگاری
مقالہ برائے ایم فل (اُردو)
مقالہ نگار
عطیہ معصومہ